تعلیم و تربیت

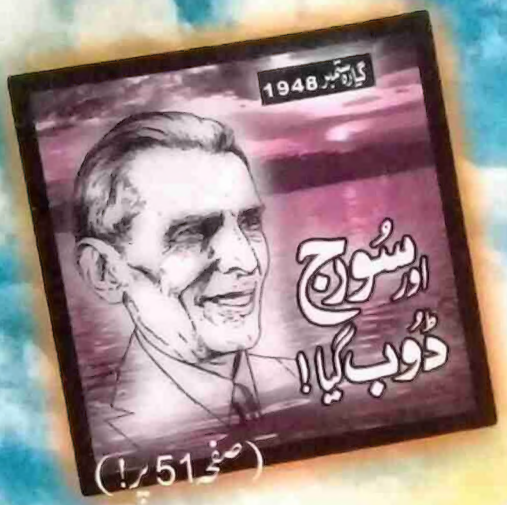

(صفحہ 51 پر!)

خطّۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام

(ایک خوبصورت تحریر صفحہ 12 پر!)

ستمبر 2004ء

64واں سال چھٹا شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا محبوب رسالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

کیسے ہیں آپ لوگ' خوش ہیں نا!...... جی ہاں ہم بخوبی جانتے ہیں کہ آپ خوش ہیں اور بہت ہی خوش' بھلا کیسے! وہ اس لیے کہ آپ سب کو "آزادی نمبر" بے حد پسند آیا ہے اور اس حقیقت کا پتا ہمیں اس طرح چلا کہ آپ کی طرف سے مبارکباد' پسندیدگی اور تہنیت کے ہزاروں خطوط ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں نے خطوط کے علاوہ یوم آزادی اور آزادی نمبر کے حوالے سے بہت سے تہنیتی کارڈز بھی ارسال کیے ہیں۔ بے حد شکریہ! خداوند تعالیٰ آپ سب کو ترقی و منزلت سے سرفراز کرے اور علم و ہنر کی دولت سے مالا مال کر کے ملک و ملت کا نام روشن کرنے کی توفیق عنایت فرمائے (آمین)

آپ نے ماشاء اللہ "یوم آزادی" شایانِ شان طور پر منایا ہو گا اور اپنے گھروں اور سکولوں کے در و بام کو سبز ہلالی پرچموں اور رنگارنگ روشنیوں سے منور کر کے بے پایاں خوشی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کیا ہو گا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے' ہنستا مسکراتا رکھے اور ایسی ہزاروں خوشیاں نصیب کرے۔ "تعلیم و تربیت" اور اس کا سارا عملہ آپ کی ہر خوشی میں برابر کا شریک ہے اور آپ کے لیے خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہمہ وقت کوشاں بھی۔ آپ سب بچوں کا تعاون اور دعائیں ہمارے لیے حوصلہ افزائی کا سامان ہیں۔

اب آیئے ذرا ستمبر کے خاص شمارے کی طرف۔ خاص شمارہ اس لیے کہ "یوم دفاع پاکستان" کے حوالے سے ہم نے اس میں پورے اہتمام کے ساتھ نظموں کے علاوہ پاکستانی جانبازوں کی سچی اور جیتی جاگتی کہانیاں شامل کی ہیں۔ ننھے ساتھیو! یاد رکھو' یہ سرزمین پاک اسلام کا قلعہ ہی نہیں ہم سب کا گھر اور جائے امان بھی ہے۔ ہماری آزادی و خودمختاری اسی کے دم سے سلامت ہے۔ آیئے اس پاک وطن کی سربلندی' اس کی حفاظت اور تعمیر و ترقی کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔

آپ ہی تو ہمارا مستقبل ہیں۔ روشن پاکستان کی ساری روشنیاں خوشیاں اور شادمانیاں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ ہم ہمیشہ کی طرح یہی کہیں گے کہ پیارے بچو! اچھے' باوقار اور خوددار پاکستانی بنیں اور اخوت و محبت اور بھائی چارے کی فضاؤں میں اپنے پاک وطن کو مضبوط' ناقابل تسخیر اور امن کا گہوارہ بنائیں۔ یوم دفاع کے حوالے سے ہم افواج پاکستان کی ہمہ دم بیدار صلاحیتوں کو سلام و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ پاک ہمارے غازیوں' مجاہدوں اور شہیدوں کو ہمیشہ سرخرو فرمائے۔ آمین والسلام.............. ایڈیٹر

اس شمارے میں

درس قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	4
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر!	تنویر پھول	5
اچھے کام!	نسیم اختر صدیقی	6
چھ ستمبر (نظم)	حکیم افتخار فخر	7
پندرہ لاکھ	نذیر انبالوی	8
خطہ لاہور تیرے		
جاں نثاروں کو سلام	نیاز علی بھٹی	12
اچھے بچو پیارے بچو!	فرحت جبیں	18
آیئے مسکرائیں		18
تم سب میرے بیٹے ہو!	حامد مشہود	22
ہو لہو کی آرزو (نظم)	احمد شکیل	28
آپ کتنے اچھے ہیں	اشتیاق احمد	29
کھیل اور کھلاڑی	سید شوکت اعجاز	32
آپ کا خط ملا	....	34
کارٹون کہانی	شاہد ریاض شاہد	36
بھگوڑا شیر	جنید احمد	37
جانوروں کی پکنک	حسن ذکی کاظمی	43
آپ بھی لکھیے	....	48
... اور سورج ڈوب گیا!	ایم یوسف خان	51
میرے پسندیدہ اشعار		56
حیران کن	سید شوکت اعجاز	57
حویلی کے بھوت	اقتدار ساجد	60
با عنوان		64

اور بہت سے دوسرے دلچسپ سلسلے

سرورق: یوم دفاع پاکستان

ستمبر 2004ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام

ایڈیٹر' پبلشر: ظہیر سلام

مشیر خاص: سید مقبول حسین شاہ

مشیر: سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد جاوید امتیازی

سید شوکت اعجاز

محمد بشیر راہی

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ' لاہور

U.A.N: 042-111-62-62-62 Fax: 042-6369204

Email: support@ferozsons.com.pk

website: http://www.taleemotarbiat.com

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بنک ڈرافٹ' چیک یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر "ماہنامہ تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ' لاہور کے پتے پر ارسال کریں۔

(فون: 6278815 - 6361310 - 6361309 فیکس: 6278816)

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) = /345 روپے۔ مشرق وسطیٰ اور افریقہ (ہوائی ڈاک سے) = 750 روپے۔

یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 830 روپے۔ امریکا اور مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 950 روپے۔

پرنٹر: عبدالسلام مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ' لاہور۔ سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم' لاہور۔

اخبارات کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ اس وقت مایوسی کا مرض ایک خطرناک عالمگیر بیماری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ مایوسی کی گرفت سے ہونے والے افسوسناک واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً نشے' گناہ' جرائم' بیماری' خودکشی وغیرہ کی متعدد اقسام انسان پر مایوسی کے غلبے کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہیں۔ پاکستان مایوسی کی اس عالمگیر لہر سے خاصا محفوظ تھا مگر چند سالوں سے اس موذی مرض نے یہاں بھی سر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ایسے افسوسناک واقعات میں اضافہ ہونے لگا ہے جو مایوسی کے غلبہ سے رونما ہوتے ہیں۔ ان کا بروقت تدارک اور علاج ضروری ہے۔

قرآن حکیم ذہنی اور جسمانی صحت و صفائی کا عظیم علمبردار ہے۔ مایوسی سے بچاؤ کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں۔ ذیل میں صرف چند ایسی آیات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو مایوسی سے بچاؤ میں تریاق کا کام دیتی ہیں:

1- "اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو! بے شک اللہ تمام گناہ بخش دیتا ہے"۔ (سورۃ 39۔ آیت 53)

2- "مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہو!" (سورۃ 15۔ آیت 55)

3- سست نہ ہو اور غم نہ کھاؤ۔ اگر تم مسلمان ہو تو تم ہی غالب رہو گے"۔ (سورۃ 3۔ آیت 139)

4- جس نے پروردگار پر ایمان رکھا' اسے نقصان اور ظلم کا خوف نہیں رہے گا۔ (سورۃ 72۔ آیت 13)

5- "جو شخص اللہ سے ڈرے گا اور اپنی اصلاح کرے گا' اس کے لیے خوف اور غم نہ ہو گا"۔ (سورۃ 7۔ آیت 35)

6- "جو کوئی نیک کام کرے گا اور وہ مسلمان بھی ہو تو اسے ظلم اور حق تلفی کا اندیشہ نہ ہو گا"۔ (سورۃ 20۔ آیت 112)

7- "بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہوتی ہے"۔ (سورۃ 94۔ آیت 6)

☆☆☆

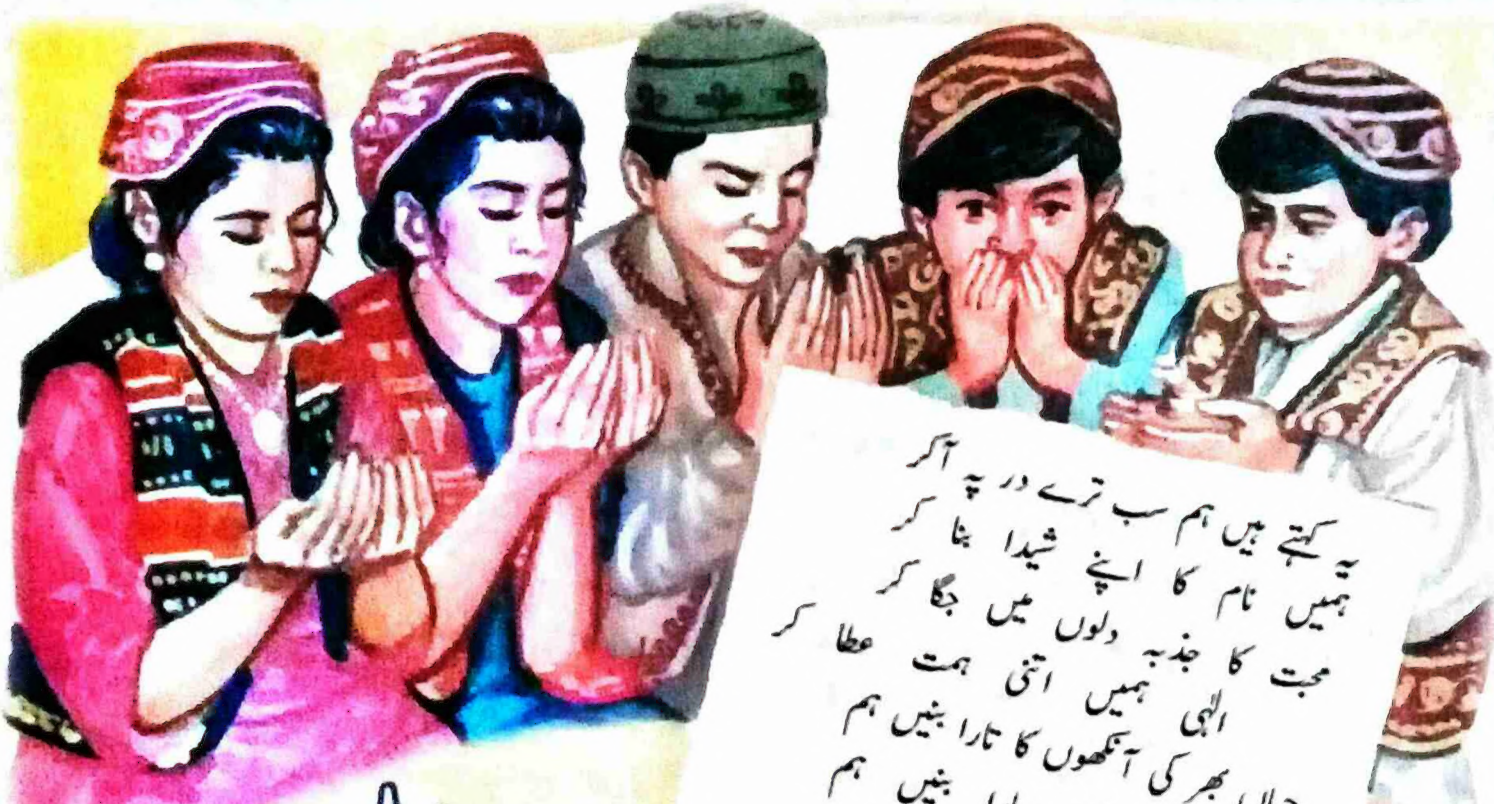

الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

تنویر پھول

یہ کہتے ہیں ہم سب ترے در پہ آکر
ہمیں نام کا اپنے شیدا بنا کر
محبت کا جذبہ دلوں میں جگا کر
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

جہاں بھر کی آنکھوں کا تارا بنیں ہم
شکستہ دلوں کا سہارا بنیں ہم
ہدایت کا روشن ستارا بنیں ہم
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

تری راہ میں جان اپنی لٹائیں
بصد شوق ہم اپنے سر کو کٹائیں
جہالت کا نام و نشاں تک مٹائیں
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

ترا نام دنیا میں پھیلا سکیں ہم
جو لاچار ہیں ان کے کام آسکیں ہم
بنیں راہبر، راہ دکھلا سکیں ہم
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

صداقت کا دامن کبھی ہم نہ چھوڑیں
نہ ہرگز اخوت کے رشتے کو توڑیں
کبھی راہ حق سے نہ منہ اپنا موڑیں
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

ترے در پہ ناچیز بندہ ہے آیا
یہی پھول کی ہے تمنا خدایا
پلٹ دیں ہم اب ملک و ملت کی کایا
الٰہی ہمیں اتنی ہمت عطا کر

شیدا: دیوانہ لاچار: مجبور لوگ کایا پلٹ دینا: حالت بدل دینا

اچھے کام

نسیم اختر صدیقی

پیارے بچو! اچھے کام سے کیا مراد ہے؟ اس دنیا میں ہر انسان زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔ وہ کام ایسا ہوتا ہے جس سے کسی دوسرے انسان کو فائدہ یا نقصان پہنچتا ہے۔ اگر فائدہ پہنچتا ہے تو اس کام کو ہم اچھا کام کہتے ہیں اور اس کا بدلہ یقینی طور پر ملتا ہے اور وہ اچھا ہی ہوتا ہے اور اگر اس کام سے کسی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کا بدلہ برا ہی ہوتا ہے۔ اچھے کاموں کو ہم اعمال صالحہ کہتے ہیں اور برے کاموں کو اعمال بد کہتے ہیں۔ لیکن کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کا نہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ کوئی نقصان' ایسے کاموں کو ہم فضول کام کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کاموں کو "لغو" کام کہا جاتا ہے۔ یقینی ایسے کام جن کے کرنے کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہو اور نہ ہی آخرت میں ان کا کوئی اچھا بدلہ یا ثواب ملے۔ ان کو فضول یا لغو کام کہتے ہیں۔

اب انسان جو کوئی بھی کام کرتا ہے ان کا تعلق انہی تین کاموں سے ہوتا ہے' اچھے کام' برے کام' فضول کام۔ آیئے اب ذرا ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے کام کون کون سے ہوتے ہیں۔ اچھے کاموں کو پہچاننے کے لیے تین باتوں کو سمجھنا ہو گا۔ اس کام کے کرنے سے اپنا دل خوش ہو جائے۔ اس کام کو کرنے سے کسی دوسرے کا دل نہ دکھے اور سب سے ضروری بات یہ کہ اس کام کے کرنے سے اللہ اور اس کا رسولؐ ناراض نہ ہوں مثلاً ہمارے لیے جو دو ضروری اچھے کام ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم پڑھنے کے لیے سکول جائیں اور کچھ وقت کھیل کے لیے ضرور نکالیں۔ اپنی پڑھائی میں قرآن مجید کا پڑھنا بھی شامل کر لیں۔ اگر سکول کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا پڑھنا سیکھیں جسے ہم تلاوت کہتے ہیں تو یہ ساری پڑھائی اچھا کام کہلائے گی۔ جو سکول کا کام ملے گھر میں آکر سب سے پہلی فرصت میں وہ کام کر لیں تو یہ بھی اچھا کام ہو گا۔ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد کچھ وقت کھیل کود کے لیے ضرور نکالیں۔

اب اگر تم کوئی ایسا کھیل کھیلو جس سے تمہاری جسمانی ورزش ہو یا ذہن زیادہ تیز کام کرنے لگے تو وہ کھیل بھی اچھا کام ہو گا اس کا بھی اچھا بدلہ کم از کم دنیا میں ضرور ملے گا مثلاً کرکٹ کھیلنا ایک اچھا کھیل ہے۔ اگر تم اس کھیل کو کسی ایسی جگہ کھیلو گے جس سے تمہاری گیند سے دوسرے کی کسی چیز کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو یا کسی انسان کے جسم سے ٹکرا کر اس کو زخمی کر دے تو یہی کام تمہارے برے کام میں تبدیل ہو جائے گا یا اس کھیل کے دوران اگر ماں باپ کی طرف سے کوئی بلاوا آجائے یا مسجد سے اذان کی آواز آجائے اور تم نماز پڑھنے کے لیے نہ جاؤ تو یہی اچھا کام تمہارے لیے برے کام میں تبدیل ہو جائے گا۔

آج کل کھیلوں میں ایک جدید ذریعہ کھیل کمپیوٹر یا ٹیلی ویژن ہے۔ اگر اس سے اچھے کھیل کھیلے جائیں یا اچھے پروگرام دیکھے جائیں تو یہ کھیل بھی اچھے کاموں میں گنا جائے گا لیکن کمپیوٹر کے ایسے کھیل یا ٹیلی ویژن کے ایسے پروگرام جس سے کوئی دنیاوی یا آخرت کا کوئی فائدہ نہ پہنچے تو وہ فضول کاموں میں شمار ہو گا۔ ٹیلی ویژن پر بچوں کی اچھی اچھی کہانیاں سنائی یا دکھائی جاتی ہیں یا سائنس کے بڑے عجیب و غریب کرشمے دکھائے جاتے ہیں ان کو دیکھنا ذہن میں یاد رکھنا اور دوسروں کو سنانا بھی اچھے کام ہیں۔ بس وہ سارے کام اچھے ہیں جن کے کرنے سے آپ کا دل خوش ہو' کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے کرنے سے اللہ' اس کا رسولؐ اور کم از کم تمہارے ماں باپ خوش ہوں اور ان کاموں کے کرنے میں تمہارے سکول یا گھر کے کام کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ورنہ یہ تمام برے اور فضول کام کہلائیں گے اور ان کا بدلہ گناہ ہو گا۔ ایسے تمام کام جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور تمہارے ماں باپ کے کہنے کے مطابق ہوں گے اچھے کام کہلائیں گے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں اچھے اچھے کام کرنے کی توفیق دے۔

(آمین)

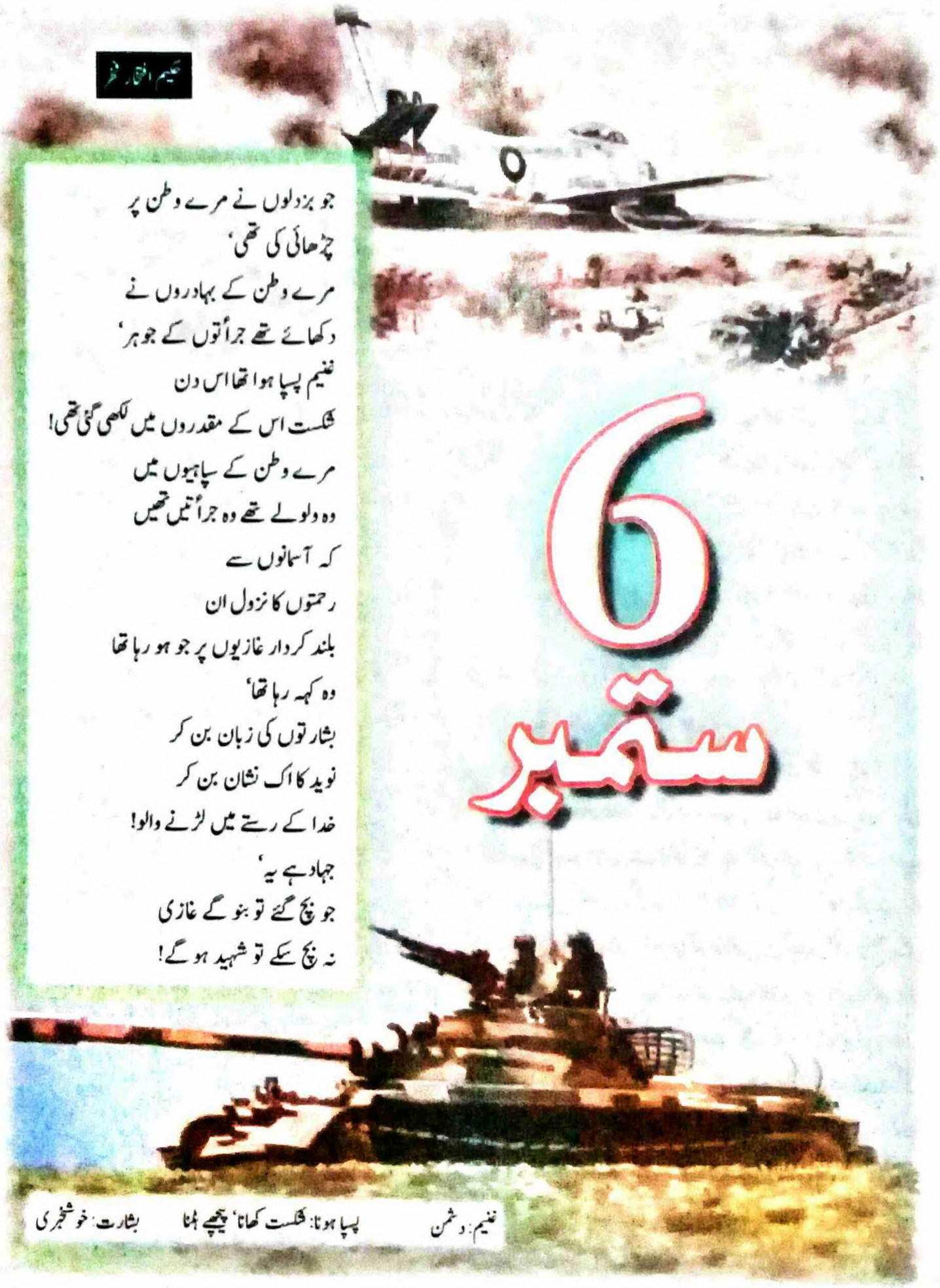

حکیم افتخار فخر

6 ستمبر

جو بزدلوں نے مرے وطن پر
چڑھائی کی تھی'
مرے وطن کے بہادروں نے
دکھائے تھے جرأتوں کے جوہر'
غنیم پسپا ہوا تھا اس دن
شکست اس کے مقدروں میں لکھی گئی تھی!
مرے وطن کے سپاہیوں میں
وہ ولولے تھے وہ جرأتیں تھیں
کہ آسمانوں سے
رحمتوں کا نزول ان
بلند کردار غازیوں پر جو ہو رہا تھا
وہ کہہ رہا تھا'
بشارتوں کی زبان بن کر
نوید کا اک نشان بن کر
خدا کے رستے میں لڑنے والو!
جہاد ہے یہ'
جو بچ گئے تو بنو گے غازی
نہ بچ سکے تو شہید ہو گے!

غنیم: دشمن　　پسپا ہونا: شکست کھانا' پیچھے ہٹنا　　بشارت: خوشخبری

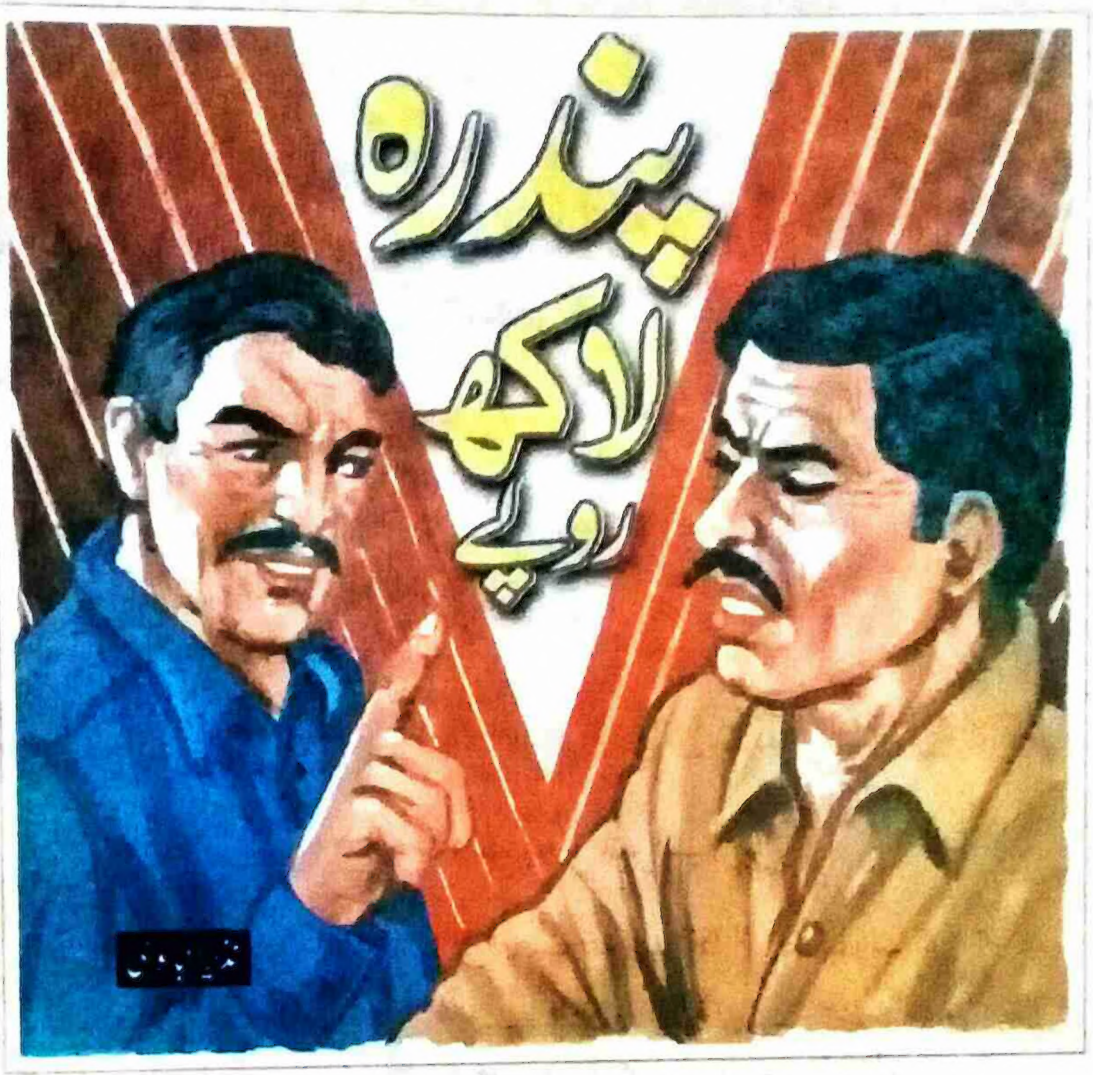

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" طارق بولا۔

"جو آپ نے سنا ہے۔ مجھے جلد از جلد دکان خالی چاہیے"۔ صہیب نے کہا۔

"مگر کیوں؟"

"میں نے مارکیٹ بیچ دی ہے"۔

"یہ بات درست نہیں"۔

"یہ بات سو فیصد درست ہے"۔

"یہ بات سراسر جھوٹ ہے۔ آپ مجھے نکال کر زیادہ کرائے پر یہ دکان کسی اور کو دینا چاہتے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو میں کرایہ بڑھانے کے لیے تیار ہوں"۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔ طارق صہیب کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"پھر میں کیوں دکان خالی کروں"۔

"دکان تو آپ کو ہر حال میں خالی کرنا ہو گی"۔

"کوئی دھونس ہے"۔

"دھونس نہیں، میں تو آپ کو بتانے آیا ہوں کہ مارکیٹ بک گئی ہے اس لیے آپ کو دکان خالی کرنا پڑے گی"۔

"اگر میں دکان خالی نہ کروں تو....." طارق نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ایسا لہجہ مت اپنایئے باہمی گفت و شنید سے معاملہ حل ہو جائے گا"۔

"آپ اچھا نہیں کر رہے!"۔

"نکلو یہاں سے"۔ طارق غرایا۔

"تمیز اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کریں"۔ دکان تو آپ کو ہر صورت خالی کرنا ہی پڑے گی"۔ صہیب کے لہجے میں بھی ہلکی سی تلخی آگئی تھی۔

"میں دکان خالی نہیں کروں گا"۔

طارق کی یہ بات سن کر صہیب دکان سے نکل گیا۔

چالیس سالہ طارق نے پندرہ سال پہلے عثمان بازار کی سہیل مارکیٹ میں ایک دکان ایک لاکھ روپے پیشگی اور ایک ہزار روپے مہینہ کرائے پر دکان لی تھی۔ اس عرصے میں اس کا کام خوب چمکا تھا۔ بازار میں وقت کے ساتھ ساتھ دکانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ کاروباری سرگرمیوں میں اضافے سے دکانوں کی قیمتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ مارکیٹوں کے مالکان میں سے اکثر نے پرانے کرایہ داروں کو نکال کر نئے کرایہ داروں کو زیادہ کرائے پر دکانیں دینے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ کوئی ذاتی استعمال کا بہانہ بنا کر دکان خالی کروا لیتا اور کوئی یہ کہتا کہ اس نے مارکیٹ بیچ دی ہے۔ کہیں بات بن جاتی اور کہیں بگڑ جاتی۔ طارق اور صہیب کے معاملے میں بات کچھ بگڑ ہی گئی تھی۔ جب آپس میں کوئی بات طے نہ پائی تو مالک دکان بازار کی تاجر یونین کے پاس چلا گیا۔ یونین کے صدر نے طارق کو بلا کر

پوچھا:

"سنا ہے آپ دکان خالی کرنے سے انکار کر رہے ہیں"۔

"جی ایسا ہی ہے" طارق نے جواب دیا۔

"آپ تو کرایہ دار ہیں۔ دکان تو آخر مالک کی ہے۔ آپ دکان خالی کر دیں۔ جھگڑا مت کریں اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہو گا"۔

"میں طارق صاحب کو مناسب وقت بھی دوں گا اور رقم بھی"۔

"میں نے پندرہ سال اس دکان میں محنت کی ہے اب کمانے کا وقت آیا ہے تو دکان خالی کر دوں، مگر ایسا نہیں کروں گا"۔

"آپ ضد مت کریں۔ بتایئے دکان خالی کرنے کے کتنے پیسے لیں گے؟"

"میں دکان خالی کروں گا تو پیسے لوں گا"۔

"دکان تو تمہیں خالی کرنا ہو گی"۔ صہیب بھی بدتمیزی پر اتر آیا۔

اس سے قبل کہ دونوں دست و گریباں ہوتے یونین کے صدر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"تم دونوں تلخ کلامی سے معاملے کو الجھاؤ مت، ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلے کا حل تلاش کرو"۔

"میں تو معاملہ سلجھانا چاہتا ہوں مگر طارق ہر بات پر نہیں "نہیں" کہہ رہا ہے۔ میں خالی ہاتھ اس کو دکان سے نہیں نکالوں گا۔ اس کو معقول رقم دوں گا"۔

"کتنی رقم دو گے؟" طارق نے پوچھا۔

"پانچ لاکھ روپے دوں گا" صہیب بولا۔

"بیس لاکھ روپے کی دکان کے صرف پانچ لاکھ روپے"۔

"بولو تم کتنے روپے لینا چاہتے ہو؟" صدر یونین نے پوچھا۔

"پندرہ لاکھ روپے میں بات بن سکتی ہے"۔

"خواب مت دیکھو، میں پانچ لاکھ روپے سے ایک روپیہ بھی زائد نہ دوں گا"۔ صہیب بولا۔

یونین آفس میں بھی بات چیت سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بازار کے کئی بزرگ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھے مگر ان کو بھی کامیابی نہ ملی۔ مالک دکان اور کرایہ دار دونوں ہٹ دھرمی پر اتر آئے تھے۔ دونوں جب ایک دوسرے کے سامنے آتے تو لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ایک صبح جب طارق دکان کھول رہا تھا، اس کی صہیب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ دکان دار درمیان میں نہ آتے تو شاید وہ ایک دوسرے کا سر پھاڑ دیتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں صبر اور برداشت کا مادہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ یونین بھی دونوں کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔ صہیب پانچ لاکھ اور طارق پندرہ لاکھ روپے پر اڑا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ اس وقت مزید الجھا جب طارق عدالت میں جا پہنچا۔ وہ عدالت سے دکان خالی نہ کرنے کا حکم نامہ لے آیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ جب پندرہ سال پہلے دونوں میں کرایہ نامہ لکھا جا رہا تھا تو اس میں دکان خالی کرنے کا وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ عدالت میں پہلی پیشی کے بعد جج نے اگلی پیشی کے لیے دو ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔ اگلی پیشی پر صہیب بیماری کی وجہ سے عدالت میں نہ جا سکا۔ جج نے مزید دو ماہ کی تاریخ دے دی۔ یوں چار ماہ میں مقدمہ پر بحث شروع ہو سکی۔ جب وکلا کے درمیان بحث شروع ہوئی تو طارق کو مقدمہ دائر کیے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ طارق نے پندرہ لاکھ کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ مقدمہ ابھی عدالت میں زیر سماعت تھا کہ ایک رات طارق دکان بند کر کے جا رہا تھا کہ کچھ آدمیوں نے اس کو کمال سٹریٹ کے پاس روک لیا:

"کیا چاہتے ہو؟" طارق کی آواز میں لرزا تھا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں"۔

"مجھے نہیں معلوم"

"تمہیں معلوم ہے بولو دکان دو گے یا جان"۔

"اچھا..... اچھا اب میں سمجھا تم صہیب کے پالتو....."۔

"زیادہ مکالمے بازی مت کرو، بولو کب دکان خالی کرو گے"

ایک آدمی نے اس کو جملہ بھی پورا نہ بولنے دیا۔

"جب پندرہ لاکھ ملیں گے"۔ طارق فوراً بولا۔

"پانچ لاکھ لو اور صبح دکان خالی کر دو ورنہ"۔

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ کچھ بھی نہیں ملے گا"۔

"یہ دھمکی کسی اور کو دینا پندرہ لاکھ روپے کے بغیر دکان

خالی نہیں ہو گی"۔ طارق نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا راستہ روکنے والے اس پر پل پڑے۔ انہوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ ایک زوردار گھونسے سے اس کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ اس واقعے نے صہیب کے حق میں کیس کو کمزور کر دیا۔ عدالت نے فیصلہ سنا دیا کہ مالک دکان کرایہ دار کو پندرہ لاکھ روپے ادا کر دے تو وہ دکان خالی کر دے گا۔ طارق کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اپنی جیت پر بازار میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صہیب اس کو پندرہ لاکھ روپیہ دے کر دکان خالی کروالے گا مگر اس کو اس وقت حیرت کا جھٹکا لگا جب عدالت کے اس فیصلے کے خلاف صہیب نے رٹ دائر کر دی۔ اب ایک مرتبہ پھر عدالتی کارروائی شروع ہوئی۔ ایک پیشی دوسری پیشی اور پھر پیشیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پریشانی کی وجہ سے طارق کی توجہ کاروبار سے بھی ہٹ گئی اور عدالتی کارروائی پر روپیہ الگ سے خرچ ہونے لگا۔ طارق کے دوسرے ہمسائے صہیب سے خود ہی معاملہ طے کر کے دکانیں خالی کر کے دوسرے بازار میں چلے گئے۔ تین سال کے عرصہ میں ان کا کاروبار دوسرے بازار میں بھی جم گیا تھا مگر طارق ابھی وہیں کا وہیں تھا۔ بازار کے شروع میں خواجہ صاحب کی دکان تھی ایک روز وہ طارق کو سمجھانے کے لیے آئے تو اس نے کہا:

"خواجہ صاحب میں مالک دکان کو سبق سکھا کر جاؤں گا کہ دکان کس طرح خالی کرواتے ہیں"۔

"ایسے جھگڑوں سے کبھی کسی کو کچھ نہیں ملا"۔

"تمہارے ساتھ والے کب سے مارکیٹ سے جا چکے ہیں تم بھی اگر تین سال پہلے چلے جاتے تو آج دوسری جگہ اطمینان سے کاروبار کر رہے ہوتے' بیٹا ضد چھوڑ دو' جو ملتا ہے لے لو' اللہ اس میں برکت ڈالے گا"۔

"نہیں خواجہ صاحب نہیں' میں تو صہیب کی عقل ٹھکانے لگا دوں گا"۔

"بیٹا میری بات مان لو ضد مت کرو"۔

"خواجہ صاحب مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کو صہیب نے میرے پاس بھیجا ہے"۔

"نہیں..... ایسا نہیں ہے..... تم نے غلط سمجھا ہے۔ میں

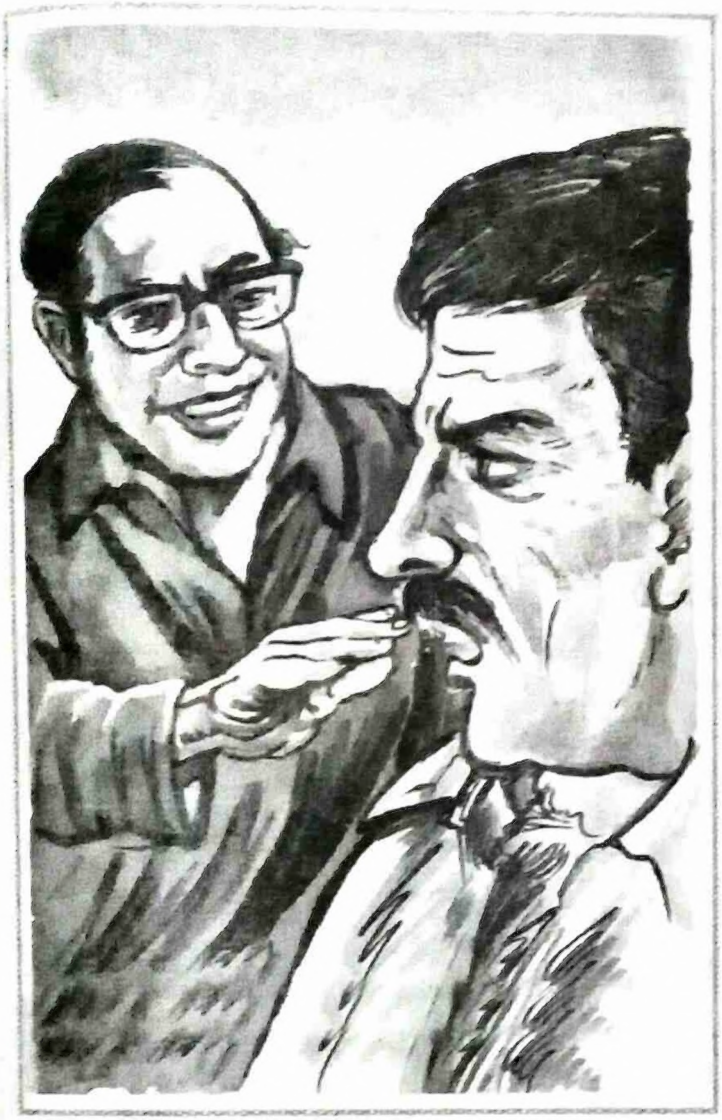

تمہاری بھلائی چاہتا ہوں وقت ابھی گزرا نہیں اب بھی سنبھل جاؤ"۔

جب انسان ہوش کی بجائے جوش سے کام لے تو بھلا بڑوں کی باتیں کب دل پر اثر کرتی ہیں۔ طارق نے تو ہوش کے سارے دروازے بند کر لیے تھے۔ جوش نے اس پر اس قدر غلبہ پا لیا تھا کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ زبان سے کہی بات اور گزرا ہوا وقت بھلا کب واپس آتے ہیں۔ وقت پر لگا کر اڑتا چلا گیا۔ فریقین نے عدالت میں آنے جانے میں چھ سال صرف کر دیئے اور فیصلہ پھر بھی کچھ نہ ہو پایا۔ مقدمے کے باعث سہیل مارکیٹ کے خریدار نے جو پیشگی رقم صہیب کو دی تھی اس کی واپسی کا بھی اس نے مطالبہ کر دیا۔

صہیب پریشان تھا تو طارق کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی وہ بھی آئے دن کی عدالتی کارروائی سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ پریشانی کے باوجود ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

ایک رات طارق دکان بند کر رہا تھا کہ صہیب اپنے کچھ

دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچا ایک دوست نے آتے ہی طارق کو گریبان سے پکڑ لیا۔

"میرا گریبان چھوڑ دو زبان سے بات کرو"۔

"زبان کی بات تو تمہیں سمجھ آتی نہیں تمہیں اب ہاتھ کی بات سمجھائیں گے"۔ بڑی مونچھوں والا چلایا۔

"تم اچھا نہیں کر رہے"۔ طارق بولا۔

"تم بھی تو چھ سالوں سے اچھا نہیں کر رہے۔ دکان خالی کرو"۔

"دکان خالی نہیں کروں گا۔ کر لو جو کرنا ہے"۔ طارق چیخا۔

دونوں طرف غصے کی حکمرانی تھی۔ یہ جھگڑا دیکھ کر کچھ لوگوں نے معاملہ رفع دفع کروانے کی کوشش کی مگر غصے نے فریقین کی عقل کو مات دے دی تھی۔ تلخ جملوں کے درمیان صہیب اور اس کے ساتھیوں کی جیبوں سے اسلحہ نکل آیا۔ اسلحہ دیکھ کر سبھی لوگ خاموش ہو گئے۔ طارق بھی اپنا گریبان چھڑا کر دکان سے ایک ڈنڈا اٹھا لایا۔ اسی اثنا میں بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرے میں فائر ہوا۔ سب نے ایک درد ناک چیخ سنی۔ جب روشنی ہوئی تو طارق کی زندگی اندھیروں سے بھر چکی تھی۔ وہ سڑک پر بے جان پڑا تھا۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ احسن اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر جا پہنچا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔

"ابا جی..... ابا جی"۔

رات کے اندھیرے میں احسن کی آواز نے سب گھر والوں کو جو چھت پر سو رہے تھے جگا دیا تھا۔

"بیٹا! احسن کیا بات ہے؟" ابا جی ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"ابا جی مالک دکان پانچ لاکھ دے رہے ہیں تو مجھے منظور ہے۔ ہم دکان خالی کر دیں گے"۔

"دو گھنٹے پہلے تو تم پندرہ لاکھ روپے اور مقدمے کی بات کر رہے تھے' اب کیا ہو گیا ہے" اس کے جواب میں احسن نے ساری بات سے اپنے گھر والوں کو آگاہ کر دیا۔

"ابا جان جو کہانی میں نے پڑھی ہے میں ویسی کہانی کا کردار نہیں بنوں گا۔ ہماری کہانی کا انجام مختلف ہو گا۔ احسن پر جوش کی بجائے ہوش کا غلبہ دیکھ کر سبھی گھر والے خوش تھے۔ احسن سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو بر آمدے میں ایک کیلنڈر پر اس کی نگاہ پڑی جس پر حدیث مبارکہ چھپی ہوئی تھی کہ "سعادت مند وہ ہے' جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑے"۔ احسن یہ حدیث پڑھ کر خوش تھا کہ اس کا شمار سعادت مندوں میں ہو چکا تھا۔

☆☆☆

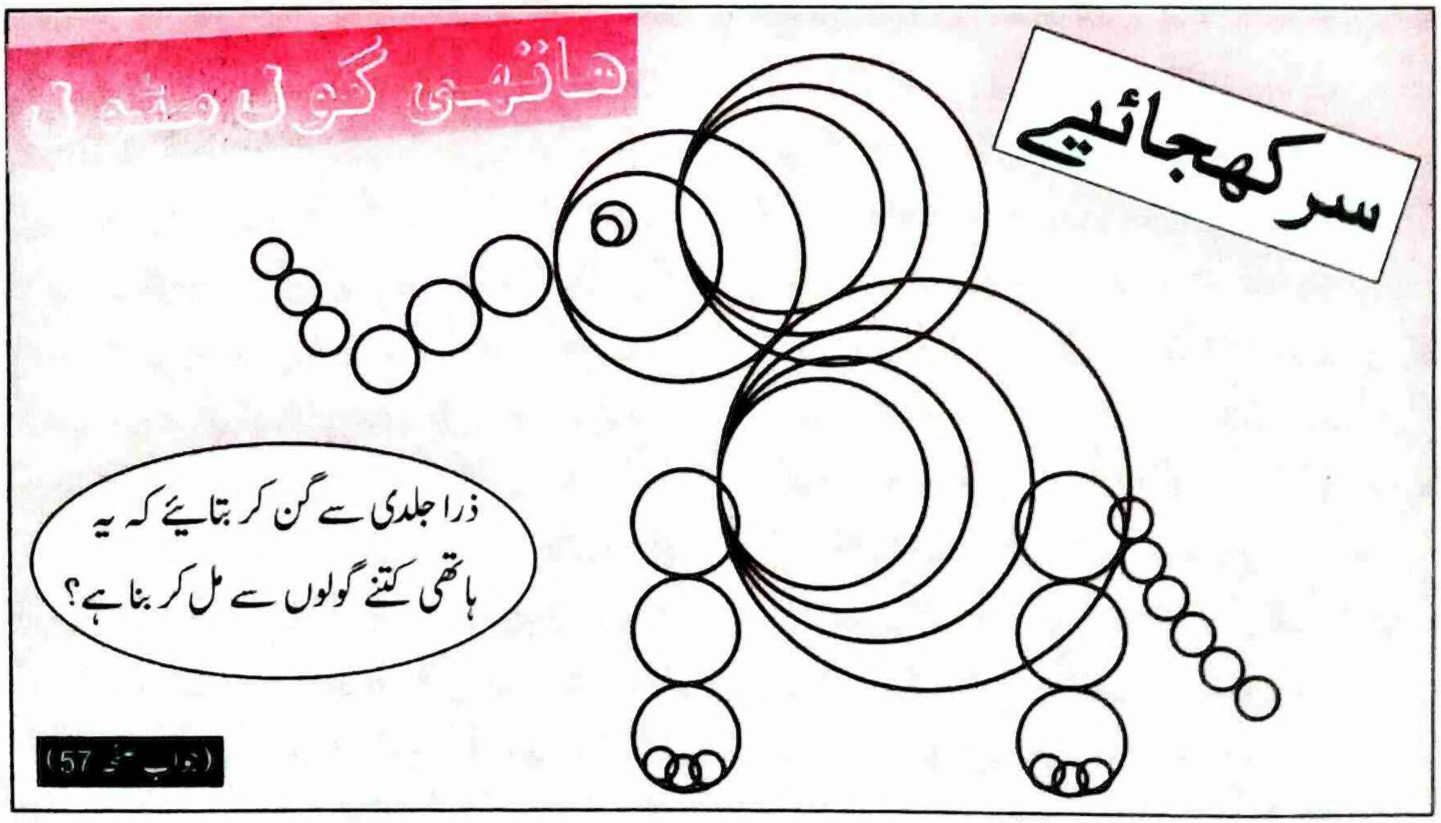

ستمبر 1965ء کے دلچسپ واقعات

خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام

نیاز علی بھٹی

"..... ہندوستان کو معلوم نہیں کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے ....." یہ تھی وہ تقریر جو صدر پاکستان مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے 6 ستمبر 1965ء کے دن ہندوستان کے پاکستان پر اچانک حملہ کے بعد کی تھی۔ اس تقریر نے پوری پاکستانی قوم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے بسنے والے تمام پاکستانی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ہندوستان کے عزائم کے خلاف ڈٹ گئے تھے اور ہندوستانیوں کا یہ خواب اور منصوبہ کہ رات کے اندھیرے میں پاکستانیوں کو روندتے ہوئے لاہور پر قبضہ کر کے جم خانہ کلب لاہور میں جشن فتح منائیں گے، کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس دن پتا چلا کہ قلم اور الفاظ میں کتنی طاقت ہے، اگر ان کے پیچھے حب الوطنی، نیک نیتی، مقصدیت، سچائی اور مصمم ارادہ ہو۔ مغربی پاکستان میں کیماڑی سے طورخم تک اور گوادر سے درہ خنجراب تک قوم کی یک جہتی، جوش، ولولہ، اخوت و محبت اور ہمدردی قابل دید تھی۔

لاہوریوں کا جوش اور ولولہ خاص طور پر قابل دید تھا۔ جب دن چڑھے 6 ستمبر کو انہیں پتا چلا کہ ہندوستان نے پاکستان کے سرحدی علاقے پر حملہ کر دیا ہے تو لاہوریے لاٹھیاں، ڈنڈے، بانس، خنجر، چاقو، بیلچے، کدال یعنی جو کچھ کسی کے پاس تھا اور بعض نہتے ہی جوش و ولولے کے ساتھ واہگہ بارڈر کو رواں دواں تھے۔ وہ تو پاک فوج نے بڑی منت محبت اور اخوت سے انہیں روکا اور کہا کہ ہم آپ کی حفاظت کے لیے بارڈر پر موجود ہیں..... ابھی آپ کی ضرورت نہیں..... آپ لوگ واپس چلے جائیں اور اندرونی حالات کو سنبھالیں۔

زندہ دلانِ لاہور واپس آئے تو انہوں نے بارڈر سے بے گھر لوگوں کے قافلے سنبھالنے شروع کیے، نہ صرف مہاجرین کے لیے اپنے دل واکر دیئے بلکہ لٹے پٹے قافلوں کے لیے جگہ جگہ کیمپ بھی لگا دیئے۔ دیگیں چڑھا دیں۔ کھانے پینے کا بندوبست کیا پھر 7 ستمبر 1965ء کو لاہوریوں نے جہازوں کی بسنت منائی۔ ایم ایم عالم ان کے ہیرو تھے جنہوں نے ہندوستانی فضائیہ کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ جونہی کوئی ہندوستانی لڑاکا جہاز گرتا لاہوریے اپنی جان سے بے پرواہ چھتوں پر کھڑے بوکاٹا کا نعرہ لگاتے۔ انہیں کوئی فکر نہ تھی کہ ہندوستانی توپوں یا جہازوں کا گولہ انہیں بھی لگ سکتا ہے! ایک ہی فلک شگاف نعرہ تھا۔ "نعرہ تکبیر۔ اللہ اکبر"۔

برکی سیکٹر سے ہجرت کر کے ہم اگلی صبح تک تحصیل اوکاڑہ (ان دنوں اوکاڑہ ضلع لاہور کی تحصیل تھی) کے ایک گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچے (دیکھئے ماہنامہ تعلیم و تربیت ستمبر 2001ء

کی کہانی: وہ ایک سفر) مگر 8 ستمبر کو میں پھر لاہور آگیا تاکہ اپنے علاقے کے متعلق معلوم کر سکوں اور بڑے بھائی صاحب جو کہ فوج میں میجر تھے ان کی خیریت کا پتا کروں۔ معلوم ہوا کہ بھائی صاحب کھیم کرن کے محاذ پر ملک کی حفاظت کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔

حالات کو دیکھ کر میں نے قصور (جو ان دنوں ضلع لاہور کی تحصیل تھی) کے لیے لاری پکڑی مگر جب ہم للیانی گاؤں (جسے آج کل شاید مصطفیٰ آباد کہتے ہیں) کے قریب پہنچے تو ملٹری پولیس (MP) نے ہمیں روک لیا۔ بہرحال جب میں نے اپنا اور بڑے بھائی صاحب کا تعارف کروایا تو انہوں نے مجھے یونٹ کے ریئر ہیڈ کوارٹر جو کہ گاؤں پانڈو کے نزدیک ایک باغ میں تھا' جانے کو کہا۔

جنگ کے دنوں میں فوجی فارمیشن کو عام طور پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایڈوانس ہیڈ کوارٹر عام طور پر اپریشنل ایریا یعنی جنگی علاقے میں یا بالکل نزدیک واقعہ ہوتا ہے۔ جہاں سے آرڈر آف بیٹل کے مطابق جنگ لڑنے والے افراد اور یونٹس کو ہدایات دی اور بتائی جاتی ہیں یعنی دشمن کی پوزیشن اور قوت کو دیکھتے ہوئے ایسے حربے جس سے دشمن آگے نہ بڑھ سکے اور پسپائی پر مجبور ہو جائے جب کہ ریئر ہیڈ کوارٹرز میں یونٹ کے شہدا اور زخمی افراد کو واپس لایا جاتا ہے جہاں سے ان کو مناسب کارروائی کے بعد ان کے لواحقین یا ہسپتال میں پہنچایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یونٹ میں نئے آنے والے افسران اور جوان بھی ریئر ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرتے ہیں جہاں ان کو بریفنگ دے کر اپریشنل ایریا میں بھیجا جاتا ہے۔

پانڈو گاؤں لاہور سے جنوب کی طرف کوئی بیس میل کے فاصلے پر نہر باری دوآب کے کنارے واقع ہے اور ایک روحانی مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جہاں حضرت عبداللہ المعروف بلھے شاہ صاحبؒ کے والد ماجد حضرت سید سخی درویش محمدؒ کا مزار ہے۔ روایت ہے کہ سید سخی درویش محمدؒ اوچ گیلانیاں کے قصبہ (جو اُس وقت صوبہ سندھ کا حصہ تھا اور اب پنجاب میں اوچ شریف کے نام سے مشہور ہے) سے کچھ گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے ہجرت کر کے ساہیوال کے علاقے ملک وال نامی گاؤں میں آکر آباد ہو گئے۔ ان دنوں پانڈو کے کے چوہدری پانڈو بھٹی کسی کام سے ملک وال کے نزدیکی گاؤں تلونڈی گئے اور وہاں کے نمبردار کو بتایا کہ انہوں نے گاؤں پانڈو کے میں مسجد تو بنا لی ہے مگر کوئی اچھا امام اور صاحبِ بصیرت معلم نہیں مل رہا جو گاؤں کے لوگوں کی عاقبت سنوار دے۔ جب لوگوں نے پانڈو بھٹی سے حضرت سید سخی درویش محمد صاحبؒ کا ذکر کیا تو وہ نمبردار کو لے کر اگلے ہی روز سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور انہیں منت سماجت کر کے پانڈو کے کی مسجد کی امامت سنبھالنے پر راضی کر لیا۔

خیر میں پانڈو کے پہنچا۔ ملٹری ٹیلیفون پر بھائی صاحب کو پیغام پہنچایا تو انہوں نے مجھے اڈہ سٹیل باغ قصور شہر آنے کو کہا۔ بعد میں حسب حکم ایک فوجی نے مجھے قصور جانے والی لاری میں بٹھا دیا۔ جونہی میں سٹیل باغ اترا تو تھوڑی دیر میں پاک وطن کی مٹی میں لت پت خاکی وردی میں ملبوس ایک جیپ میں بھائی صاحب آئے اور مجھے اشارے سے اپنے ساتھ بٹھا لیا کیونکہ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اب ہم پھر کھیم کرن کو چل پڑے۔ راستے میں میں نے بھائی صاحب کو خاندان کے مختصر حالات بتائے کہ ہم کرتی سیکٹر سے ہجرت کر کے ہمشیرہ صاحبہ کے پاس اوکاڑہ کے ایک گاؤں پہنچ چکے ہیں۔ کوئی بیس منٹ کے بعد ہم بی آر بی پر تھے۔ بھائی صاحب نے مجھے خداحافظ کہا اور ڈرائیور کو مجھے واپس سٹیل باغ پہنچانے کو کہا۔ بھائی صاحب نے صرف ایک بات کہی: "ان شاء اللہ! ولٹوہا پر قبضہ کر کے پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گا"۔ (ولٹوہا کھیم کرن سے آگے ہندوستانی علاقے میں تقریباً دس میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں سے ہمارا آبائی شہر پٹی تقریباً اتنا ہی اور آگے ہے)۔ مجھے بھائی صاحب کے جذبات سن کر بہت خوشی ہوئی۔

اسٹیل اڈہ قصور سے میں نے اوکاڑہ براستہ ٹھینگ موڑ (اب اسے اللہ آباد موڑ کہتے ہیں جہاں سے ایک سڑک دیپالپور' حویلی لکھا کو بھی جاتی ہے) چونیاں اور پتوکی جانے والی لاری لی۔ جب میں نے کنڈکٹر کو کرایہ دینا چاہا تو ڈرائیور نے کنڈیکٹر سے کہا "میجر صاحب کے بھائی سے کرایہ نہیں لینا"۔ کنڈیکٹر نے مجھ سے کرایہ نہیں لیا۔ میں نے ازراہ مذاق اس سے کہا کہ مجھے تو روز اس روٹ پر سفر کرنا ہے۔ کرایہ نہیں لو گے تو کیا کرو گے! تو اس نے خوشدلی سے کہا "آپ کسی لاری پر قصور سے اوکاڑہ یا لاہور جائیں آپ سے کرایہ نہیں لیں گے"۔ میں بڑا خوش ہوا اور پوچھا "مگر کیوں؟" تو

اس نے جواب دیا "جب آپ کے بھائی صاحب ملک کے دفاع میں جان تک دینے کو تیار ہیں تو کیا ہم آپ کی یہ ذرا سی خدمت بھی نہیں کر سکتے!" یہ تھی سپرٹ ان دنوں! ہر شخص تگ و دو میں تھا کہ کسی طرح وہ بھی ملک کے دفاع میں حصہ ڈالے۔ ہر چہرے پر حب الوطنی اور بشاشت چمکتی تھی!

تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن میں لاہور یا قصور کا چکر لگاتا اور واپسی پر عام طور سے لاری یا ٹرین سے رات کے گیارہ بارہ بجے اترتا اور پھر پیدل ہی ریناله خورد کے قریب واقعہ ایک گاؤں کو جاتا۔ گاؤں کا اڈے سے فاصلہ تقریباً ڈھائی میل کے قریب تھا۔ راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا۔ وہاں سے گزر کر ایک چھوٹی نہر کے کنارے کنارے کوئی ایک میل چلنے کے بعد میرا گاؤں آتا تھا نہر کے دونوں طرف اونچے اونچے اور پرانے بڑے بڑے شیشم کے درخت تھے جو کافی جگہوں پر نہر کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ نہر پر دن کے وقت بھی تقریباً سائے کی وجہ سے اندھیرا رہتا تھا۔ بہت خوبصورت منظر تھا۔ مگر رات کو یہ منظر بہت ڈراؤنا ہو جاتا۔ اندھیرے میں جب درختوں کے پتے ہلتے تو ایسے لگتا جیسے کوئی جن آرہا ہو! گھپ اندھیرا اور کچا راستہ۔ دور جا کر نہر پر ایک پلی تھی جس سے ہم عام طور پر گزر کر گاؤں پہنچتے تھے۔ مگر رات کے اندھیرے میں ڈر کی وجہ سے خون خشک ہو جاتا تھا۔

ایک رات حسب عادت جونہی میں درختوں کے سائے تلے ہو کر نہر کے کنارے کنارے گاؤں کو چلنے لگا تو میں نے انسانی بو محسوس کی اور یوں لگا کہ شاید کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اب ان کی کھسر پھسر مجھے سنائی دینے لگی۔ میں نے قدم تیز کر دیئے۔ "گوریلا ہے..... گوریلا ہے"۔ کی آہستہ آہستہ آواز آنے لگی۔ ان دنوں یہ مشہور تھا کہ ہندوستان رات کو اپنے گوریلا فوجی پاکستانی علاقے میں اتار رہا ہے تاکہ وہ نہریں کاٹ دیں' پل اڑا دیں' ریلوے لائینوں کو نقصان پہنچائیں اور یوں پاکستان کی حکومت کے لیے اندورنی مسائل پیدا کئے جائیں تاکہ وہ جنگی محاذ پر کمزور پڑ جائے۔ ملک میں بدامنی ہو اور لوگ خوف و ہراس میں مبتلا ہو جائیں۔ اب یہ آوازیں چاروں طرف سے میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ "ہوشیار گوریلا" جب یہ آوازیں میرے بہت قریب ہو گئیں تو میرا خون خشک ہو گیا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میں گوریلوں کے نرغے میں آگیا ہوں! اگر وہ پاکستانی ہیں تو ضرور دیہاتی ہوں گے جو میری سنے بغیر مجھے مار دیں گے۔

خیر میں نے اپنے اوسان بحال کیے اور ہمت کر کے کہا: "خبردار' میں کوئی گوریلا وریلا نہیں ہوں۔ جو کوئی بھی ہے وہیں رک جائے" جواب آیا۔ "سب گوریلے یہی کہتے ہیں کیونکہ ان کی تربیت میں یہ شامل ہوتا ہے کہ کبھی شناخت مت کراؤ..... پکڑو اسے یہ ہندوستانی گوریلا ہے اور ہمارے ہوتے ہوئے بچ کر نہ جائے" اب میں ڈر گیا کہ آئی لاٹھی! لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور پھر کہا "دیکھو میں کوئی گوریلا یا ہندوستانی نہیں ہوں۔ میں پاکستانی ہوں اور فلاں گاؤں کے فلاں شخص کا بھائی ہوں۔ اگر کسی نے مجھے نقصان پہنچایا تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہو گا"۔ جواب میں کھسر پھسر ہوئی "یہ واقعی ہندوستانی گوریلا ہے۔ یہ ان کی ٹریننگ کا حصہ ہے کہ جب مصیبت میں ہوں تو کسی بڑے آدمی یا بدمعاش کا نام لے لو! آگے بڑھو یہ جھوٹ بولتا ہے پکڑو اسے پیشتر اس کے کہ اور ساتھی پہنچ جائیں اور یہ بچ نکلے" پھر میرے نہ نہ کہتے ہوئے بھی ان میں سے ایک نے گھما کر لاٹھی کا وار کیا۔ اندھیرا تھا اگر میں بھاگتا تو اور بھی مشکوک ہو جاتا خیر خدا کی قدرت وہ وار میں نے اپنے ہاتھوں سے روک کر اس شخص سے اس کی لاٹھی چھین لی (حالانکہ میں اتنا بہادر نہ تھا!) میں نے پھر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں کہہ جو رہا ہوں کہ میں کوئی ہندوستانی گوریلا نہیں ہوں..... ایک میل پر میرے بھائی کا گھر ہے وہاں لے چلو مجھے اور تصدیق کر لو"۔ ان میں سے ایک نے کہا "دیکھا کیسا ٹرینڈ اور دھوکے باز ہے! کہہ رہا ہے کہ اس کے ساتھ چلو تاکہ راستے میں یہ ہم سے بھاگ جائے۔ پکڑو اس کو" اس کے بعد ان پانچوں افراد نے ایکا کیا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نیچے گرا تو انہوں نے صافوں اور پگڑیوں سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پھر ایک شخص نے مجھے مردہ لاش کی طرح کندھے پر اٹھایا اور کہا: بڑا ہوشیار بنتا تھا۔ اٹھاؤ اور لے چلو چیرمین صاحب کے پاس"۔

ان دنوں صدر ایوب کے BD سسٹم (بنیادی جمہوریت) کے تحت چیرمین یونین کونسل کو بہت اختیارات حاصل تھے۔ رات کے کوئی تین بجے کے قریب وہ مجھے چیرمین کی حویلی میں لے گئے۔

"چیرمین صاحب دروازہ کھولو ایک گوریلا پکڑ لیا ہے"۔ ان میں سے ایک شخص نے حویلی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

"ہائیں گوریلا پکڑ لیا ہے!"۔ چیرمین کے نوکر نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

"ہاں' ہاں دروازہ کھولو اور چیرمین صاحب کو بتاؤ۔ بڑا ہوشیار ہے یہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے جلدی سے بتاؤ انہیں" ایک دوسرے شخص نے نوکر سے کہا۔

پھر جلد ہی کپڑے سنبھالتے ہوئے چیرمین صاحب بھی آگئے "کدھر ہے گوریلا؟" انہوں نے لالٹین کی روشنی میں پوچھا۔

"یہ رہا جی" مجھے کندھے سے اتارتے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

"اس کے چہرے سے کپڑا ہٹاؤ" چیرمین نے حکم دیا۔

جب میرے منہ سے کپڑا ہٹا تو میں نے شکر کا سانس لیا۔

"اس کے ہاتھ پاؤں کھولو" چیرمین نے پھر کہا۔

"نہ جی بھاگ جائے گا بڑا ہوشیار ہے۔ بڑی مشکل سے قابو کیا ہے؟" تیسرے شخص نے جواب دیا۔ "اگر ہم سات لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ بھاگ جائے تو لعنت ہے ہم سب پر؟" چیرمین نے جواب دیا۔

اب ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں کھولے' مجھے سانس آیا اور ہوش بھی۔

ہندوستان کی کس یونٹ سے تمہارا تعلق ہے..... تمہارے ساتھی کتنے اور کدھر ہیں۔ تمہارے ٹارگٹ کیا تھے..... کب سے اس علاقے میں ہو.....؟" چیرمین نے چھوٹتے ہی ڈھیروں سوال کر ڈالے "دیکھیں جی میں کوئی گوریلا وریلا نہیں ہوں" میں نے سانس بحال ہونے پر چیرمین سے کہا۔

"تو پھر اتنی رات نہر توڑنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے؟"۔

اب باوجود تکلیف میں ہونے کے مجھے ہنسی آگئی اور کہا "چیرمین صاحب میں کوئی فرہاد نہیں ہوں کہ خالی ہاتھوں سے نہر کو توڑ سکوں اور نہ ہی میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے کہ نہر کو اڑا سکوں۔ آپ لوگوں کو غلطی ہوئی ہے۔ میں نے ان کو بھی بتایا تھا

کہ میں فلاں گاؤں کے فلاں شخص کا قریبی بھائی ہوں"۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ تم اتنی رات وہاں کیا کر رہے تھے؟" چیئرمین نے پوچھا۔ اس کے بعد میں نے انہیں ساری تفصیل بتائی جس پر چیئرمین صاحب کو تھوڑا یقین آیا اور افسوس کرنے لگے اور کہا "مجھے لاہوریوں کی اپنے علاقہ میں آمد کا پتا ہے اور آپ کے بھائی صاحب کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے جن سے لاٹھی کے وار کی وجہ سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"ان سے پوچھ لیں" میں نے ان اشخاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"او ئے کم بختو یہ تم لوگوں نے کیا کیا۔ میں نے تمہیں کہا ہوا ہے کہ کوئی ایسا ویسا مشکوک نظر آئے تو اسے پکڑ کر زندہ سلامت میرے پاس لاؤ۔ میں نے ڈانگ سوٹے کے استعمال سے تمہیں منع کیا تھا"۔ چیئرمین نے ان لوگوں سے غصے سے کہا۔ اس کے بعد ان کا نوکر کوئی تیل سا لایا اور میرے ہاتھوں پر مل دیا جس سے خون رسنا تو بند ہو گیا مگر تکلیف میں بھی اضافہ ہوا۔ اس کے بعد نوکر نے مجھے گرم دودھ کا بڑا گلاس پلایا تو میری طبیعت کچھ بحال ہوئی۔

"چیئرمین صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں جاؤں" میں نے اجازت مانگی۔

"بالکل نہیں اب آپ میرے مہمان ہیں تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ صبح میرے آدمی آپ کے ساتھ جائیں گے اور یہ آپ کو بخیریت گھر چھوڑ کر آئیں گے اور بھائی صاحب سے میری طرف سے معذرت بھی کریں گے"۔

دن چڑھے جب میں ہاتھوں پر پٹیاں باندھے تین افراد کی معیت میں اپنے گھر پہنچا تو سارے خاندان والے پریشان بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے بہانہ بنایا کہ حادثہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اگر بھائی صاحب کو اصل بات بتائی تو وہ میرے ساتھ آنے والوں کو جوتے مارتے ہوئے سیدھے چیئرمین کی حویلی لے جائیں گے!

☆☆☆

خطۂ لاہور
تیرے جاں نثاروں کو سلام!

جنگ ستمبر کے دوران ہمارے شاعروں نے جب قومی/ وطنی/ دفاع پاکستان اور ہمارے افواج کے لیے کارناموں کی روشنی میں بہت سے ترانے تخلیق کیے جو عوامی سطح پر بے حد مقبول ہوئے اور آج بھی ولولہ انگیز محسوس ہوتے ہیں۔ یوم دفاع (6 ستمبر) کے حوالے سے معروف شاعر رئیس امروہوی کا لکھا ہوا یہ ترانہ اپنی مقبولیت کے لحاظ سے آج بھی سرفہرست ہے!

خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام!
شہریوں کو غازیوں کو شہسواروں کو سلام

خطۂ لاہور' کیا کہنا ہے تیری خاک کا
تو ہے استالن گراڈ اس سرزمینِ پاک کا
ارضِ شالامار' راوی کے کناروں کو سلام

ایک ہی جھٹکے میں دشمن کی کلائی موڑ دی
تو نے باطل کی کمر ضربِ گراں سے توڑ دی
اے شہیدوں کے چمن تیری بہاروں کو سلام

زورِ بازو پر ترے اہلِ وطن کو اعتماد
زندہ و پائندہ و رخشندہ و تابندہ باد
شانِ فتح و کامرانی کے نظاروں کو سلام

رحمتیں زندہ دلانِ خطۂ لاہور پر!
چار جانب گونجتا ہے نعرۂ فتح و ظفر
اپنے پیاروں کو دعائیں اپنے یاروں کو سلام
خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام!

خادموں اور نوکروں سے آنحضور ﷺ کا نیک برتاؤ:

حضور ﷺ اپنے خادموں سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی یا کوتاہی ہو بھی جاتی تو آپؐ درگزر سے کام لیتے اور فوراً ان کا قصور معاف فرما دیتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو آپؐ کے خادموں میں سے تھے اور تقریباً دس سال تک آپؐ کی خدمت میں رہے، کہا کرتے تھے کہ "اتنے عرصے میں میرے آقا پیارے نبی ﷺ نے مجھے نہ کبھی کسی بات پر ڈانٹا اور نہ کسی غلطی پر باز پرس کی بلکہ غلطی معاف فرما دیا کرتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ درگزر سے کام لیتے تھے اور نہایت شفقت سے پیش آتے تھے"۔

ننھے ساتھیو! ہمیں بھی اپنے نوکروں خادموں اور ماتحتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے۔ بلاوجہ یا ضرورت سے زیادہ سختی کرنے کے بجائے سمجھ بوجھ، تحمل اور شفقت سے ان کی اصلاح کرنا اور نہایت درگزر سے کام لینا ہی حضورؐ کی تعلیم کے مطابق ہے۔

آنحضورؐ کی باقاعدگی اور وقت کی پابندی:

ہمارے حضورؐ کی نظر میں وقت کی بہت قدر تھی۔ آپؐ وقت کو بے حد قیمتی خیال کرتے تھے۔ وقت کی پابندی آپؐ کے نزدیک نہایت ضروری تھی۔ آپؐ نے زندگی کا ہر کام وقت پر کرنے کا سبق دیا ہے۔ پانچوں وقت کی نمازیں اپنے مقررہ اوقات پر ادا کرنے کا حکم بھی اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے۔

پیارے نبی ﷺ ہر کام وقت پر باقاعدگی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے روزانہ کے معمول میں سونے جاگنے، عبادت کرنے، اپنے احباب اور دوستوں سے ملاقات کرنے، مختلف معاملوں کے فیصلے کرنے، تبلیغ اور حکومت کے کام نمٹانے یہاں تک کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ملنے، بیٹھنے اور گھریار کے کام کاج کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ غرض اپنے سارے کاموں میں آپؐ پابندی وقت کا پورا خیال رکھتے تھے۔

ہمیں بھی وقت کی قدر و قیمت کا پورا احساس ہونا چاہیے اور اپنا ہر کام وقت پر باقاعدگی اور بہتری سے کرنا چاہیے۔

پیارے نبیؐ کا صبر و تحمل:

آنحضور ﷺ کی پوری زندگی صبر و تحمل کا درس دیتی ہے۔ کتنے ہی صدموں اور غموں کے پہاڑ ٹوٹے کفار کی جانب سے شدید مخالفت کے طوفان اٹھے، ظلم و ستم کی آندھیاں اُمڈ اُمڈ کر آئیں۔ دشمنوں نے کتنے ہی شیطانی حیلے آزمالیے۔ آپؐ اور آپؐ کے خاندان والوں سے تعلق توڑے رکھا۔ آپؐ پر طرح طرح کے ظلم و ستم

کیے۔ راستے میں کانٹے بچھائے۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا۔ منہ پر برا بھلا کہا۔ آپؐ کے علاوہ آپؐ کے ساتھیوں پر بھی سختیوں کی انتہا کر دی اور پھر یہاں تک کہ آپؐ کی جان تک لینے کا شیطانی منصوبہ تیار کیا۔ مگر آپؐ نے ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ آپؐ کے ساتھیوں نے بھی نہایت صبر و تحمل سے تمام سختیوں کا مقابلہ کیا۔ اللہ نے آپ کو اور آپؐ کے جان نثاروں کو کفار پر عظیم فتح عطا کی۔ دشمنوں نے آخر منہ کی کھائی اور اسلام کا پرچم سربلند ہو کر ہی رہا۔

بچو! مکہ کے قریب ایک سرسبز بستی ہے جس کا نام طائف ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں وہاں ثقیف نامی قبیلہ آباد تھا۔ آنحضرت ﷺ اس قبیلے کو دعوت اسلام دینے کے لیے تشریف لے گئے تو ان لوگوں نے نہ صرف آپؐ کی بات سننے سے انکار کیا بلکہ آپؐ کو سخت تکلیف دی۔ انہوں نے پتھر برسا برسا کر حضورؐ کو سخت زخمی کر دیا یہاں تک کہ آپؐ لہولہان ہو کر گر پڑے۔ اللہ کی طرف سے فرشتہ حاضر ہوا اور آپؐ سے اجازت مانگی کہ اگر حضورؐ فرمائیں تو طائف کی پوری بستی کو دو پہاڑوں کے درمیان کچل دیا جائے۔ مگر حضورؐ کا صبر و تحمل دیکھئے کہ اس حالت میں بھی آپؐ کے لبوں سے کافروں کے لیے بددعا کی بجائے دعائے خیر ہی نکلی۔ آپؐ نے فرمایا: "نہیں! میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ یہ لوگ ہلاک ہو جائیں بلکہ مجھے تو اب بھی اُمید ہے کہ اللہ ان میں سے ایسے لوگ ضرور پیدا کرے گا جو کفر و شرک چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کرنے والے ہوں گے"۔

بچو! صبر و تحمل ہو تو ایسا ہو ہم بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر کوئی معمولی سی مشکل یا تکلیف پیش آئی اور ادھر ہم بے قراری میں اوٹ پٹانگ ہانکنے لگے! زندگی میں ذرہ برابر بھی آزمائش آجائے تو ہم کبھی دوسروں کو کوسنے لگتے ہیں اور کبھی اپنی قسمت کو۔ یہ رویہ بالکل غلط ہے۔ اگر آپ کا کوئی ساتھی آپ سے کسی قسم کی زیادتی کرے اور اس کی حرکت سے آپ کو رنج یا تکلیف پہنچے بھی تو آپ کو چاہیے کہ اپنے آپ پر قابو رکھیں۔ غصے میں ہرگز نہ آئیں۔ نہ تو آپے سے باہر ہو کر اسے برا بھلا کہیں اور نہ ہی اس کے لیے بددعا کریں بلکہ نہایت صبر اور تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے سمجھائیں کہ: دوست! آپ نے یہ زیادتی کی ہے اور آپ کی اس حرکت سے مجھے تکلیف پہنچی ہے آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یوں آپ نہ صرف اسے دل سے معاف کر دیں بلکہ اللہ کے حضور اس کے حق میں نیکی اور بھلائی ہی کی دعا کریں۔

اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ اگر آپ کا برتاؤ ایسا ہی اچھا ہو اور آپ ہر معاملے میں صبر و تحمل سے کام لیں تو کوئی بھی آپ کا برا چاہنے والا نہیں ہو گا بلکہ ہر طرف آپ کے دوست ہی دوست ہوں گے اور آپ کی زندگی اللہ کے فضل سے پرسکون اور نہایت کامیاب رہے گی۔

ہمیں ہر پریشانی اور مشکل کا نہایت ثابت قدمی اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے اور اپنے اللہ پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے پوری کوشش اور ہمت سے راستے کی تمام رکاوٹوں پر قابو پانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

جب اللہ کی ہر مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہو تو پھر گھبرانے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے! پریشان ہو کر ہمت ہار بیٹھنا مسلمان کا کام نہیں!

رحیم اور کریم نبیؐ:

رحیم کا مطلب ہے رحم کرنے والا اور کریم کے معنی ہیں کرم کرنے والا۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ رحیم بھی ہیں اور کریم بھی بلکہ آپؐ تو ہر ایک کے لیے رحمت ہی رحمت ہیں۔ آپؐ ہر ایک کے مونس و غم خوار تھے۔ ہر ایک سے ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ آپؐ کو اپنی امت سے بے حد پیار تھا اور ہر وقت اس کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ کبھی آندھی یا بادل آجاتے تو امت کی پریشانی کے خیال سے آپؐ کے چہرہ مبارک پر فکر اور غم کے آثار ظاہر ہونے لگتے۔ آپؐ ہمیشہ اپنی امت کی بخشش اور بہتری کی دعا مانگتے اور اکثر یہ دعا مانگتے ہوئے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو جاتے: "اَللّٰھُمَّ اُمَّتِی" (اے اللہ میری امت!)

(باقی آئندہ)

☆☆☆

ایک دفعہ تین افراد بیٹھے تھے کہ مولوی صاحب آئے اور کہنے لگے۔ بھئی اللہ کی راہ میں بھی کچھ خرچ کر دیا کرو۔ وہ تینوں بولے: ہم تو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ مولوی صاحب پوچھنے لگے کہ تم اللہ کی راہ میں کس طرح خرچ کرتے ہو۔

پہلے آدمی نے جواب دیا: میں زمین پر ایک لائن کھینچ کر روپے اوپر پھینک دیتا ہوں۔ جتنے روپے لائن سے دائیں طرف گرتے ہیں وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہوں اور بائیں طرف گرنے والے روپے خود استعمال کرتا ہوں۔

دوسرا آدمی کہنے لگا کہ میں تو دائرہ لگاتا ہوں۔ جتنے روپے دائرے کے اندر گرتے ہیں وہ خدا کی راہ میں دے دیتا ہوں ار جو باہر گرتے ہیں وہ خود استعمال کرتا ہوں۔

تیسرا آدمی کہنے لگا۔ میرا طریقہ تو بہت ہی سادہ ہے میں روپے اوپر پھینک دیتا ہوں۔ خدا جتنے چاہے رکھ لے باقی جو ہوتے ہیں وہ میں خرچ کر دیتا ہوں۔

(عثمان قریشی' میرپور آزاد کشمیر)

باغ میں مالی نے ایک لڑکے کو آم توڑتے ہوئے دیکھا تو غصے میں بولا: "ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

لڑکے نے کہا:

"جناب آپ کے کچھ آم گر گئے تھے میں انہیں اٹھا کر درخت پر لگا رہا ہوں"۔ (آمنہ طفیل' راہوالی)

ایک آدمی کے پاس بولنے والا طوطا تھا جس کی یہ خوبی تھی کہ وہ نئی باتیں جلد سیکھ جاتا تھا مگر پرانی بھول جاتا تھا۔ ایک دن طوطے نے سیکھ لیا "کون ہے؟" ایک روز گھر میں سوائے طوطے کے کوئی نہ تھا۔ دودھ والے نے دروازے پر دستک دی تو طوطے نے پوچھا "کون ہے؟"

دودھ والے نے جواب دیا "دودھ والا" طوطے نے پھر پوچھا کون؟ دودھ والے نے پھر جواب دیا "دودھ والا" چار پانچ مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ آخر تنگ آکر دودھ والے نے پوچھا "تم کون ہو؟"

طوطا بولا "دودھ والا" (نثار مصطفیٰ' ملتان)

عید سے چند دن پہلے ایک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ اس کے پاس ایک بیل ہے جسے وہ منڈی میں بیچنے کے لیے جا رہا ہے۔ راستے میں اس سے کسی نے کہا کہ پانچ روپے کا یہ بیل مجھے دے دو۔

اس آدمی نے غصے سے کہا۔ واہ! اتنے بڑے بیل کے صرف پانچ روپے۔ اتنے میں اس آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ نہ بیل ہے اور نہ پانچ روپے۔ بڑا پریشان ہوتا ہے اور جلدی سے آنکھیں بند کر کے ہاتھ آگے بڑھا کر کہتا ہے۔ "لاؤ پانچ روپے ہی دے دو"۔

(عثمان قریشی' میرپور آزاد کشمیر)

استاد: (بچے کے باپ سے) آپ کا بچہ بہت ہوشیار ہے: اس نے سکول کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔

باپ: آ لینے دو اس کم بخت کو گھر میں شیشے توڑتا ہے اور سکول میں ریکارڈ۔ (ملیحہ مقبول' اسلام آباد)

احمد: ابا جان بادل آگئے ہیں۔

باپ: (بے خیالی سے) تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو انہیں اندر بٹھا دو اور پوچھو' ٹھنڈا پئیں گے یا گرم۔

(محمد طیب کوٹلہ خان)

زرافے، زیبرے

چار ٹانگوں والا مینار

زرافے کی قدرتی طور پر اپنے گرد و پیش کے ماحول میں گھل مل جانے کی صلاحیت ایک اعلیٰ درجے کی مثال ہے۔ یہ جانور اونچے درختوں کے پتوں اور شاخوں سے اپنی خوراک کی ضروریات پوری کرتا ہے' اونچے قد اور لمبی گردن کے علاوہ اس کی لمبی اور لچکدار زبان بھی ان چیزوں کو گرفت میں لینے اور کھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا نشان زدہ جسم اونچے اور گھنے درختوں کے سائے میں اسے ڈھکا چھپا رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی بڑی جسامت اور بے پناہ طاقت اُسے تمام درندوں سے محفوظ رکھتی ہے ماسوائے انسان اور ببر شیر کے۔ زرافہ اپنی پچھلی ٹانگوں سے بے پناہ قوت کے ساتھ دولتی مار سکتا ہے جو بڑے سے بڑے جانور کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ زرافہ 30 میل فی گھنٹے کی رفتار کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔ زرافے اونچے قد والے جانوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا قد 19 فٹ اور وزن نصف ٹن تک ہوتا ہے۔

گھوڑے کا فرسٹ کزن: زیبرا

افریقہ کے صحرائی میدانوں میں گروہوں کی شکل میں نظر آنے والا زیبرا گھوڑے کا بھائی بند لگتا ہے۔ اگرچہ یہ گھوڑے کی طرح پالتو نہیں ہے تاہم اپنے کزن گھوڑے سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے بھاگتا ہے۔ بھاگتے ہوئے اس کی رفتار بسا اوقات چالیس میل سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کی نگاہ اور سونگھنے کی حس ناقابلِ یقین حد تک بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کی نگاہ اور سونگھنے کی حس ناقابلِ یقین حد تک تیز ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ اپنے جانی دشمن شیر کی موجودگی آدھ میل سے بھی زائد فاصلے سے محسوس کر لیتا ہے۔ زیبرا قید و بند کی حالت میں بھی نسل پروری کرتا ہے تاہم گھوڑوں کی طرح اسے سدھانا بالکل ناقابل عمل ہے۔

جو شخص صحیح معنوں میں اللہ سے ڈرتا ہے دنیا کی ہر شے اس سے ڈرتی ہے!

تم سب میرے بیٹے ہو

دو ببر شیر نہ جانے کہاں سے چلے تھے کہ ایک چلچلاتی صبح کو بی بی جنت کی زمین میں آن گھسے۔ بی بی اس وقت وہاں ایک کیاری میں بیٹھ کر پھول گوبھی کی پنیری میں کھرپے کی مدد سے نلائی کر رہی تھیں۔ شیر انہیں دیکھ کر دھاڑے تو وہ اٹھ کر بڑے رعب سے بولیں: "کیا بات ہے' جنگل کم پڑ گئے ہیں یا تم انسانوں پر ظلم کرنا چاہتے ہو"۔

بی بی جنت کی بات سن کر شیر یوں خاموش کھڑے ہو گئے کہ جیسے اپنے رویئے پر نادم ہوں۔

بی بی نے انہیں ہاتھ کا اشارہ کر کے حکم دیا: "ادھر وہ سامنے گھنا جنگل ہے جاؤ اس میں رہو"۔

حیرانی کی بات یہ تھی کہ غراتے ہوئے شیر آہستہ آہستہ اس جنگل کی طرف کھسک نکلے۔ ان کی غراہٹ بالکل معذرت خواہانہ تھی گویا کہہ رہے تھے کہ "بی بی معاف کر دیں ہم اپنی دنیا میں واپس جا رہے ہیں"۔

جنت بی بی سرحد کے قریب اپنے ڈیرے میں رہتی تھیں۔ وہ وہاں تنہا رہتی تھیں۔ وہ بہت متقی' پرہیز گار اور خدا سے ڈرنے والی خاتون تھیں۔ اسی لیے تو شیر ان کی ہدایت ٹال نہ سکے اور سر جھکا کر وہاں سے چلتے بنے کیوں کہ جو شخص صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے دنیا کی ہر شے اس سے ڈرتی ہے۔

جنت بی بی اپنی زمین میں زیادہ تر پنیری ہی کاشت کرتی تھیں۔ ضرورت مند ان سے پنیری خرید لیتے تھے یا اس کے علاوہ وہ سبزی کاشت کرتی تھیں جو کنجڑے ان کے کھیتوں سے خود آکر لے جاتے تھے۔ انہوں نے ڈیرے پر دو بکریاں' موٹی موٹی مرغیاں' قیں قیں کرتی بطخیں اور اچھلتے پھدکتے خرگوش بھی پالے ہوئے تھے اور ان کی نگرانی کے لیے ایک خوف ناک کتا "ڈبو" بھی۔

بی بی کا ڈیرا گاؤں کی آبادی سے خاصا ہٹ کر واقع تھا جس کے ایک طرف ملکی سرحد کو راستہ جاتا تھا تو دوسری طرف ایک جنگل تھا۔ جنگل بہت بڑا تو نہیں تھا کہ اس میں ہاتھی گینڈے اور

زرافے اینڈتے پھرتے مگر بھیڑیے وغیرہ ضرور پائے جاتے تھے۔ بی بی کے شکارنے پر شیر اس جنگل میں جا گھسے جو ان کے شایان شان تو نہیں تھا مگر ان کے لیے پناہ گاہ ثابت ہوا۔ وہ سارا دن جنگل کی چھاؤں میں گزارتے اور رات کو جنگل کے حبس سے پہلو بچا کر بی بی کی زمین کے ساتھ موجود میدان میں کھلی فضا کے مزے لیتے۔ وہ نرم نرم گھاس پر لوٹنیاں لگاتے اور خوب آنکھ مچولی کھیلتے۔ پھر وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر لمبی تان کر سو جاتے۔ بی بی کا پالتو کتا "ڈبو" پہلے پہل تو شیروں کی آمد پر خوب خفا ہوا مگر بی بی نے اسے سمجھا دیا۔

شیروں کی آمد کے چند دن بعد بی بی کا پندرہ سالہ پوتا "ذکوان" سکول کی چند چھٹیاں گزارنے شہر سے اپنی دادی اماں کے پاس آیا۔ ایک شام جب گرمی کا زور ٹوٹا تو بی بی ذکوان کو کھیر کھلانے کے لیے گاؤں سے ساگودانہ خریدنے گئیں۔ وہ جب واپس اپنے ڈیرے پر پہنچیں تو کچھ اور ہی روح فرسا منظر ان کے سامنے تھا..... ان کے ڈیرے پر پندرہ سولہ کڑیل جوان دندناتے پھر رہے تھے جنہیں دیکھ کر سب جانور تشویش اور بے قراری میں مبتلا تھے کیوں کہ وہ وہاں پر اجنبی لوگوں کی آمد کے خوگر نہیں تھے۔ ایک طرف ڈبو جال میں بے بس پڑا ہونے کے باوجود بھونک رہا تھا' آزاد ہونے کے لیے کلبلا رہا تھا تو دوسری طرف ذکوان کے سر پر ایک کڑیل جوان نے آتشیں ہتھیار کی چھاؤں کر رکھی تھی۔ کون ہو تم اور یہ کیا بدمعاشی ہو رہی ہے؟" بی بی نے کوئی خوف محسوس کیے بغیر انہیں ڈانٹ کر پوچھا۔

"خالہ جان! ہم آپ کے معزز مہمان ہیں" ایک مسخرا مسکرا کر بولا۔

"ہر مہمان معزز ہی ہوتا ہے۔ تم میرے مہمان بننا چاہتے ہو تو میرے بچے کو آزاد کرو اور ڈبو کا جال کھولو"

یہ کہہ کر وہ ان کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلے دور سے بی بی کی پر تاثیر آواز ہی سنی تھی اب وہ ان کے چہرے پر موجود ایک تقدس بھی ملاحظہ کر رہا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا "خاتون! ہم بھوکے ہیں اور ہمیں کھانا چاہیے"۔

"میری بات پر پہلے عمل کرو پھر اپنا مطالبہ پیش کرو" بی بی نے سکون سے اسے سمجھایا۔

اس آدمی کے قلب و جگر میں بی بی کی بات اتر گئی۔ اس نے آہستگی سے اشارہ کیا تو اس کے ساتھیوں نے ذکوان کو آزاد کر دیا اور ڈبو کا جال بھی کھول دیا۔ ذکوان اور ڈبو دوڑ کر بی بی کے پاس پہنچ گئے۔ بی بی نے ڈبو کو حملہ کرنے سے منع کر دیا تو وہ ان کے پاس کھڑا ہو کر دم ہلانے لگا۔

"ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟" بی بی نے ان سے پوچھا۔

"ہم بھوکے ہیں" اسی جوان نے کہا۔

"کیسے بھوکے ہو تم کہ دوسروں کے سر پر چڑھ گئے ہو اور اسلحہ لہراتے پھرتے ہو' بھوک مٹانے

کے لیے تمہیں کوئی شریفانہ راستہ نہ ملا؟..... خیر اب آگئے ہو تو میں کوشش کروں گی کہ تم سب کی بھوک مٹ جائے۔ کمرے میں سے چارپائیاں باہر نکال کر ان پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں کھانا تیار کرتی ہوں"۔

پھر ذکوان نے ایک موٹا تازہ مرغ ذبح کیا اور بی بی نے آٹا گوندھا۔ تھوڑی دیر بعد آگ سے بھرے بڑے چولہے پر پریشر ککر چھک چھک کرنے لگا۔ بھوکے دبے لفظوں میں ایک دوسرے سے باتیں اور کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخرکار بھوکوں کے سامنے کھانا چن دیا گیا اور وہ بہت بے صبری کے ساتھ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ روٹی سالن اور سلاد وہ ہر شے چٹ کر گئے صرف برتن باقی بچ گئے کہ وہ انہیں چبا نہ سکتے تھے۔

"ہاں اب اطمینان سے مجھے بتاؤ کہ تم سب کیا دھندا کرتے ہو' چوری کرتے ہو یا ڈاکے ڈالتے ہو؟" تب بی بی نے ان سے پوچھا "لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ اپنی ماں سے جھوٹ نہ بولنا کیوں کہ میں نے تم سب کو اپنے بیٹے سمجھ کر کھانا کھلایا ہے ڈر کر نہیں"۔

بی بی کی بات میں بڑا وزن تھا۔ ایک بار تو ان سب کو سانپ سونگھ گیا پھر ناک پر تل والے جوان نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں جی..... ہمارا تعلق ایک مظلوم قبیلے سے ہے۔ ظلم سہتے سہتے آج ہم بالآخر پھٹ پڑے تو ظالم بھاگ اٹھے۔ ہم ظالموں کا ہی تعاقب کرتے پھرتے ہیں کیوں کہ اگر وہ بچ نکلے تو ہم ہی نہیں ہمارے اگلے پچھلے بھی مارے جائیں گے"۔

بی بی نے اس بیان کو یوں سنا کہ جیسے انہیں اس پر یقین نہ آیا ہو۔

"یعنی کہ تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے نکلے ہو" بی بی نے توقف کے بعد کہا۔

"ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ تم کس بستی کے باسی ہو جہاں کوئی قاعدہ قانون لاگو نہیں ہوتا۔ ہم سب کو کیسے سمجھائیں کہ ہم پر ظلم اس انداز میں کیا جاتا تھا کہ قانون کو دکھانے کے لیے کوئی ثبوت باقی نہیں بچتا تھا"۔ اس جوان نے جواب دیا۔

بی بی نے کہا "میں دعاگو ہوں' اللہ پاک تم سب کے لیے بھی کوئی بہتر سبیل پیدا کرے گا"۔

پھر ان جوانوں نے بی بی سے وہیں پر رات گزارنے کی اجازت لی۔ وہ ایک صاف کھیت میں چادریں بچھا کر لیٹ گئے جو انہوں نے اپنے مختصر سے سامان میں سے نکالی تھیں۔ بی بی نے انہیں رات کے وقت میدان کی طرف جانے سے منع کر دیا اور انہیں بتا دیا کہ وہاں شیر شب بسری کرتے تھے۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ رات کا سکوت شیروں کے دھاڑنے سے ٹوٹ گیا اور بی بی کے ڈیرے پر موجود ہر ذی روح نیند سے بیدار ہو گیا۔ ڈبو زور سے اس سمت کی طرف منہ کر کے بھونکا جدھر سے شیروں کی آواز آئی تھی۔ بی بی اسے خاموش رہنے کا حکم دے کر چارپائی سے اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ جوانوں کا گروہ کھیتوں میں سے نکل کر میدان کی پٹی پر جا پہنچا ہے۔ رات کی سیاہ چادر میں ان کے صرف ہیولے نظر آرہے تھے مگر بی بی کے لیے معاملہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ شیر کیوں دھاڑے تھے۔ پھر اچانک میدان میں کسی نے روشنی کا گولا پھینکا تو دور سے بھی روشنی سے بدکنے والے شیر واضح طور پر نظر آگئے۔ اس کے ساتھ ہی روشنی کا دوسرا گولا شیروں کے تعاقب میں پھینکا گیا۔

میدان میں اس طرف دوبارہ تاریکی چھائی تو اس کی دوسری پٹی پر جس کے ساتھ ہی جنگل کا کنارہ تھا اسی طرح روشنی کے گولے پھینکے گئے۔ جنگل کے تناور درخت ایک بار پھر روشنی میں نہا گئے۔ میدان دوبارہ تاریک ہو گئے مگر کچھ دیر بعد بی بی کو آہ و بکا کی آوازیں سنائی دیں۔ ذکوان بھی اٹھ بیٹھا اور بی بی سے اس معاملے کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ بی بی ایک کمرے میں سے گن نکال لائیں۔

ان کا یہ روپ دیکھ کر ذکوان حیرت سے بولا "دادی ماں! آپ اور گن؟"

"ہاں میں اور گن..... اللہ پاک نے ان بے راہ رو افراد کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی اجازت بھی دی ہوئی ہے جو راہ ہدایت پر چلنے سے منکر ہی رہتے ہیں۔ اس میدان میں کوئی بدمعاشی کی جارہی ہے آؤ ذرا دیکھتے ہیں"۔

ذکوان نے بھی اسلحہ تھام لیا اور اپنی دادی ماں کے ساتھ جائے حادثہ پر جا پہنچا۔ میدان میں بہت پرانا اور بڑا کنواں تھا جو سطح آب نیچے گر جانے اور علاقے میں ٹیوب ویل رائج ہو جانے پر

متروک ہو چکا تھا۔ سیلابی پانی نے عدم توجہ کے شکار کنویں کو کافی حد تک مسمار کر ڈالا تھا۔ جنت بی بی کے ڈیرے سے کھانا کھانے والے افراد اس کنویں کے گرد جمع تھے۔ بی بی نے ٹارچ روشن کر کے ان سے معاملہ پوچھا تو انہوں نے فوراً ٹارچ کی روشنی کی طرف اپنا اپنا اسلحہ سیدھا کر لیا اور اس کے ساتھ ہی کنویں میں سے انسانی نالہ و فریاد کے ساتھ ساتھ شیروں کی غراہٹ بھی سنائی دی۔

"اپنا اسلحہ نیچے کر لو...... اسلحہ ہم دونوں کے پاس بھی ہے مگر ہم نے ابھی اسے تم پر تانا نہیں کہ اس کی ابھی ضرورت نہیں"۔

بی بی کے حکم میں ایک عجیب حلاوت تھی ایک عجیب اثر تھا۔ سب نے اسلحہ نیچے کر لیا۔ بی بی نے پوچھا "اس کنویں میں شیر کس پر غرا رہے ہیں؟"

"ہمارا ایک ساتھی کنویں میں شیروں کے قابو آ گیا ہے" ایک جوان نے پریشان آواز میں کہا۔

"اوہو...... یہ تو بہت برا ہوا شاید میں تم لوگوں کی کوئی مدد کر سکوں" بی بی نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

مسمار کنویں میں ایک بہت بڑا بل تھا۔ بل کیا تھا مورچہ ہی تھا۔ بی بی نے دیکھا کہ کچھ جوان اس بل کے منہ میں سے رسے ڈنڈے ڈال رہے تھے اور ٹارچ روشن کر کے اپنے ساتھی کو آوازیں دے رہے تھے۔ بی بی نے بل میں ٹارچ روشن کر کے دیکھا۔ اس میں سے شیروں کی غراہٹ کے ساتھ ساتھ انسانی کراہ بھی سنائی دے رہی تھی جس میں اذیت کا نہیں بلکہ خوف کا پہلو نمایاں تھا یعنی شیروں نے ابھی جوان کو کھانا یا کاٹنا شروع نہیں کیا تھا۔

"یہ جوان اندر کیسے پہنچا؟" بی بی نے جوانوں سے پوچھا۔

"یہ ٹھوکر کھا کر کنویں میں گرا تو شیر جو پہلے ہی اندر موجود تھے اسے کھینچ کر اور اندر لے گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہمیں اس کنویں کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ اس کے کتنے منہ ہیں اور کتنے راستے ہیں۔ گولی اس کے اندر نہیں جائے گی اگر چلائی جائے تو بے کار جائے گی۔ سارا کنواں ہم نہیں کھود سکتے"۔ ایک جوان نے بے بسی کے عالم میں ساری تفصیل بی بی کو یوں سنائی گویا وہ ان کا کوئی اعلیٰ افسر ہو۔

بی بی نے سب کو خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا اور بل کے منہ میں اپنا منہ ڈال کر زور سے کہا "شیرو! اس جوان کو چھوڑ دو"۔

سب جوان بی بی کو شدید حیرت سے دیکھنے لگے کہ وہ شیروں کو بھی حکم دے رہی ہیں!

جواب میں شیر یوں بھنا کر غرائے گویا بی بی کے حکم کے خلاف سخت احتجاج کر رہے ہوں۔

بی بی نے پھر پچکار کر شیروں کو رام کرنے کی کوشش کی: "اچھے شیرو! اس جوان کو چھوڑ دو۔ ان کی غلطی معاف کر دو تو میں تم دونوں کو ایک ایک بکری کھلاؤں گی۔ اچھے شیرو اس جوان کو چھوڑ دو اور مجھے بل کے اندر داخل ہونے پر مجبور نہ کرو"۔

پھر شیروں نے جو آوازیں نکالیں انہیں غراہٹ نہیں بلکہ اطاعت کہتے ہیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک مٹی سے اٹا ہوا جوان دیوانگی کے عالم میں باہر نکلا اور باہر نکلتے ہی نیچے گرنے کے لیے لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے سہارا دیا۔ بی بی نے ذکوان کو بکریاں اور چھری وہاں پر لانے کے لیے بھیج دیا۔ ایک جوان فوراً بولا: "اب ہمارا ساتھی تو رہا ہو گیا ہے اب بھلا بکریاں شیروں کو کھلانے کی کیا ضرورت ہے"۔

بی بی نے اس سے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو کہ میں اپنے وعدے سے منحرف ہو جاؤں؟"

یہ سن کر انہوں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی ان سب کے ہاتھ اٹھے..... وہ بی بی کو بہت ادب کے ساتھ سلام کر رہے تھے کیوں کہ ناک پر تل والا جوان سنبھل چکا تھا اور بی بی کو سلام کر رہا تھا۔

اس جوان نے کہا "آپ کا پوتا آپ کو دادی ماں کہتا ہے اگر اجازت ہو تو میں بھی آپ کو ماں کہہ لوں۔ بی بی نے مسکرا کر کہا: "پگلے! میں نے تو بہت دیر پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم سب میرے بیٹے ہو"۔

ایک جوان نے پوچھا" یہ شیر آپ کے پالتو ہیں یا آپ سے مانوس ہو چکے ہیں"۔

بی بی نے بتایا "یہ شیر نہ تو میرے پالتو ہیں اور نہ مجھ سے مانوس ہیں..... یہ تو چند دن پہلے نہ جانے کہاں سے ادھر ٹپک پڑے ہیں"۔

"تو پھر یہ آپ سے ڈرتے کیوں ہیں؟" ایک نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ مجھ سے نہیں اللہ پاک سے ڈرتے ہیں۔ تم بھی اللہ پاک کے قریب آؤ' سچا تقویٰ اختیار کرو تو یہ تم سے بھی کنی کترائیں گے..... جو شخص صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے دنیا کی ہر شے اس سے ڈرتی ہے"۔

پھر بی بی نے ان جوانوں کو نیکی اچھائی اور بھلائی کا وہ درس دیا جو ہر انسان کے رگ و پے میں سما جانے کے قابل ہے۔ اتنے میں ذکوان دونوں بکریاں اور چھری لے کر وہاں پہنچ گیا تو بی بی نے بکریاں ذبح کروا کر کنویں کے پاس رکھ دیں اور شیروں کو دعوت دے کر جوانوں کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ بی بی نے درندوں کے ساتھ بھی ایفائے عہد کیا تھا۔ ایسی خاتون کے سامنے انہوں نے بھلا کیا سر اٹھانا تھا۔

جنت بی بی سے ایک جوان نے پوچھا "ماں جی! ان شیروں کے دل میں کیا سمایا کہ انہوں نے کنویں میں چھپ کر ایک شریف انسان کو یرغمال بنا لیا؟"

بی بی نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا کہ تم لوگوں نے میدان میں سے گزرنے کے لیے شیروں پر روشنی پھینکی اور انہیں ڈرا کر بھگانا چاہا تو وہ اپنی فطری پناہ گاہ "جنگل" کی طرف لپکے مگر ادھر سے بھی جب تمہارے ساتھیوں نے روشنی پھینک کر ان کا راستہ روک دیا تو یہ کنویں کے نیچے جا گھسے اور جب ایک جوان ٹھوکر کھا کر کنویں میں گرا تو یہ اسے پکڑ کر اندر لے گئے۔ انہوں نے ستانے والے کو مار ڈالنا تھا مگر پہلے یہ تم سب کو کچھ سمجھا رہے تھے"۔

"یہ ہمیں کیا سمجھا رہے تھے؟" سوال کیا گیا۔

"یہ تمہیں سمجھا رہے تھے کہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا پاک کو یہ فعل پسند نہیں"۔

پھر بی بی نے ذرا توقف کے بعد کہا "تم سب نے بھی اپنی حدود سے تجاوز کر کے غلط قدم اٹھایا ہے۔ کسی بھی رکھوالے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی اور دیس پر لشکر کشی بغیر کسی معقول وجہ کے یا قبضہ جمانے کے لیے کرے" ایک جوان بولا "ماں جی! آپ ہمیں نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں"۔

انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا "میں تم سب کو سمجھ چکی ہوں' ظالموں کو تلاش کرنے والے کسی ڈیرے پہ جاتے ہی اسلحہ نہیں نکال لیتے' مسافروں کے پاس روشنی کے گولے نہیں ہوتے'

وہ شیروں سے علاقہ صاف نہیں کرانا چاہتے..... میرے اپنے تین بیٹے باری باری اس دیس کے دفاع میں شہید ہو چکے ہیں۔ مائیں دیس کی حفاظت کے لیے بیٹے پالتی ہیں مگر کسی اور دیس پر حملہ کرنے کے لیے نہیں۔ جاؤ اپنی ماؤں کے بیٹے بنو اور اپنے دیس کو سنوارو۔ یہ دنیا آگ جلانے کے لیے نہیں پھول اگانے کے لیے رب نے بسائی ہے"۔

ناک پر تل والا جوان آگے بڑھ کر بولا "ماں جی! ہم واپس جا رہے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے ڈیرے پر آپ کے ساتھ قدرے سخت لہجہ اختیار کیا' جھوٹ بولا اور شیروں سے علاقہ خالی کرانے کے لیے ان پر حملہ کیا۔ میری مدد میں آپ کی دونوں بکریاں بھی ذبح ہوئیں اور..... اور میں بہت شرمندہ ہوں کہ ہم نے آپ کے دیس میں گھس کر بھی آپ کو دھوکا دیا اور آپ کا نمک کھا کر بھی فوراً نمک حرامی کا ثبوت دیا۔ آپ ہمیں سچے دل سے معاف کر دیں ماں جی!"

بی بی نے انہیں سمجھایا "زبانی کلامی معافی کو کوئی حیثیت نہیں ہوتی اگر اپنا رویہ نہ بدلا جائے۔ جاؤ میری باتوں پر عمل کرو شاباش"۔

پھر وہ سب جوان رات کے اندھیرے میں بی بی سے جدا ہو کر سرحد کی طرف بڑھے اور درختوں کے ایک ذخیرے میں موجود سرنگ کے دہانے میں داخل ہوئے جسے گھاس پھونس سے چھپایا گیا تھا۔ وہ سرنگ میں چلتے جا رہے تھے اور اپنے پیچھے بم رکھتے جا رہے تھے۔ سرحد کے پار سرنگ سے باہر نکل کر انہوں نے سرنگ مکمل طور پر تباہ کر دی.....

ناک پر تل والے جوان کو اس دیس کے آرمی ہیڈ کوارٹر میں فوراً طلب کر لیا گیا۔ اس کا ممتحن چوڑے چکلے کندھوں والا بوڑھا جرنیل تھا۔ جرنیل نے غرا کر کہا "کپتان! قدرت نے ہمیں موقع دیا کہ اتفاقی طور پر صدیوں پرانی سرنگ دریافت ہو گئی جو کسی بادشاہ نے بنوائی تھی۔ تجھے تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ سرنگ میں سے ادھر بھیجا گیا کہ دو چار دن میں ہمسایہ ملک کی فوجی تنصیبات کا کھوج لگاؤ اور ہمیں کلیئر اپ کا اشارہ دو تاکہ ہم سرنگ میں سے فوج داخل کر کے ہمسایہ دیس پر راتوں رات قبضہ کر لیں مگر تیری کارکردگی کیا رہی..... صفر؟"

کپتان نے بتایا "سر! ہم اپنے مشن میں ناکام رہے ہیں۔ ہر مشن کامیاب تو نہیں ہوتا"۔

جرنیل گرجا "تم نے مشن خود رول بیک کیا ہے اور پھر سرنگ بھی تباہ کر ڈالی!"۔

"یس سر!" کپتان نے فوراً اقرار کر لیا۔

جرنیل نے اچھل کر میز پر مکا مارا اور چیختے ہوئے بولا: "یس سر کے بچے! تیرا کورٹ مارشل ہو گا اور میں تیری کھال کھینچ لوں گا"

"مجھے منظور ہے" کپتان اطمینان سے بولا۔

پھر کپتان نے الف سے لے کر یے تک ہر بات تفصیل سے جرنیل کے گوش گزار کر دی۔ جرنیل نے اپنا منہ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں چھپا لیا اور کچھ دیر بعد اس نے ہاتھ پرے ہٹائے تو اس کی آنکھیں اشک بار ہو چکی تھیں۔

جرنیل بولا "اس عظیم خاتون کے شہید بچے آج بھی زندہ ہیں۔ ہماری تمام تر کوشش کے باوجود ان کا دیس ہمارے لیے ناقابل تسخیر ہے۔ وہاں کی نہ جانے کتنی ماؤں کے کتنے جوان یوں ہی زندہ ہوں گے اور اپنے دیس کے رکھوالے بھی!"

"یس سر! ان کا کہنا ہے کہ آگ کی جگہ گلزار کو دے دو"۔

جرنیل نے کہا "وہ بالکل درست کہتی ہیں۔ ہم ہی دولت کی دیوانگی میں دوسروں کے دیس روندنے چل پڑے ہیں۔ کپتان! وہ سچ کہتی ہیں' خدا سے ڈرنے والے سچ ہی کہتے ہیں"۔

کپتان نے کہا "سر! میں بڑی سے بڑی سزا کے لیے تیار ہوں مگر میں اس دیس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا جہاں مائیں اس قدر باہوش اور پروقار ہیں"۔

پھر جرنیل نے قلم دان میں سے سرخ قلم باہر نکالا' سامنے میز پر پڑی ایک فائل پر سرخ نشان لگا کر اسے پرے رکھ دیا اور بولا "اس عظیم ماں کی ممتا کی داستان سن کر آج مجھے اپنی ماں بہت بری طرح یاد آئی ہے..... ماں بہت بڑی نعمت ہے کپتان!"

اور کپتان نے رقت آمیز لہجے میں ادھوری بات کی۔ "جس دیس کی مائیں جاگتی ہیں.....!"۔

☆☆☆

احمد شفیق

ہونہار کی آرزو

چراغِ علم دے دل کے میرے آئینہ خانے میں
اندھیرا دور ہو اور روشنی پھیلے زمانے میں

منافع بخش سب کے واسطے جو علم ہو' وہ دے
نہ ہو آزردگی کا حرف بھی میرے فسانے میں

نہ میری ذات سے پہونچے کسی کو کوئی دکھ ہرگز
سکون و امن کا پیغام ہو میرے ترانے میں

مجھے توفیق دے کام آسکوں جس کو ضرورت ہو
تُو دے سکتا ہے سب کچھ کیا نہیں تیرے خزانے میں

تو قادر ہے مگر دکھ ساتھ سکھ کے کر دیئے پیدا
تو جانے راز کیا ہے یہ جہاں ایسا بنانے میں

بڑے اچھے عمل کا کر دیا مختار انساں کو
کوئی تو مصلحت ہو گی ہمیں یوں آزمانے میں

کروں ماں باپ کی خدمت' بزرگوں کی کروں عزت
رہوں کوشاں میں ہم عمروں سے بھی الفت نبھانے میں

میں خوش حالی رکھوں پیش نظر اس ملک و ملت کی
رہوں سرگرم پرچم چاند کا اونچا اڑانے میں

رکھوں امید بس تجھ سے ہو تیرا خوف بھی دل میں
رہے الفت ترے محبوبؐ کی اس دل کے خانے میں

ترے بندوں کے دکھ اور درد میں ہمدم رہوں ہر دم
ملے راحت مرے دل کو کسی کا غم مٹانے میں

رہوں ثابت قدم مدمقابل جو بھی مشکل ہو
برا جب وقت کٹ جائے لگوں پھر گھر سجانے میں

مجھے توفیق دے گرتوں کو بڑھ کر تھام لینے کی
ادائے فرض سمجھوں گم شدہ رستہ دکھانے میں

وہ جینا بھی ہے کیا جینا جو بس اپنی ہی خاطر ہو
نہیں وہ زندگی گزرے جو سونے اور کھانے میں

یہ جسم و جاں امانت ہے' ترے بندوں کے کام آئے
نہ گزرے زندگی احمد کی بس دم آنے جانے میں

منافع بخش: نفع دینے والا　آزردگی: پریشانی، تکلیف　ہمدم: ساتھی

آپ کتنے اچھے ہیں

اشتیاق احمد

خالدہ کے ہاتھ میں بالکل نئی گڑیا تھی۔ عائشہ کی نظریں گڑیا پر جم سی گئیں۔ وہ خوب صورت تھی۔ اس کا لباس زرق برق تھا۔ آنکھیں مٹکاتی تو اور بھی اچھی لگتی تھی۔

"کیوں عائشہ! پسند آئی میری گڑیا؟ میری تو الماری بھری پڑی ہے ایسی چیزوں سے کسی روز آکر دیکھ لینا۔"

"میں..... میں ضرور آؤں گی۔"

"آپ کے ابو بھی تو آپ کے لیے کھلونے لاتے ہوں گے' آپ کی الماری میں بھی تو گڑیاں اور دوسرے کھلونے بھرے ہوں گے۔" خالدہ نے پوچھا۔

"میری الماری میں کھلونے تو ضرور ہیں لیکن اتنے زیادہ نہیں۔ اتنی اچھی گڑیا بھی کوئی نہیں ہے لیکن میں ابو سے کہوں گی۔ اب وہ بھی میرے لیے ایسی گڑیا لائیں گے۔"

"ضرور! کیوں نہیں۔"

دوسرے دن وہ خالدہ کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوئی اور فوراً اپنے کمرے میں لے آئی۔

"یہ رہی میری الماری۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے الماری کھول ڈالی۔ عائشہ کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ الماری میں تو واقعی بے تحاشہ کھلونے سلیقے سے سجے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک چیز موجود تھی۔ دس بارہ تو گڑیاں ہی تھیں۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ وہ دیر تک ایک ایک کھلونے کو اٹھا کر دیکھتی رہی.....

ان لمحات میں اس نے اپنے دل میں عجیب سی پریشانی محسوس کی۔ وہ قدرے بے چین ہو گئی اور پھر تمام کھلونے دیکھ لینے کے بعد اس نے کہا:

"اب میں چلوں گی کافی دیر ہو گئی۔"

"اچھی بات ہے۔"

وہ گھر لوٹی تو چپ چپ سی تھی۔ اس کے ابو اور امی نے یہ بات فوراً بھانپ لی' ابو بولے:

"خیر تو ہے ہماری بیٹی چپ چپ سی کیوں ہے؟"

"ابو! میں خالدہ کے گھر گئی تھی نا۔"

"ہاں ہاں..... تو پھر؟" وہ بولے۔

"اس نے مجھے اپنے کھلونوں کی الماری دکھائی ہے

آپ کو کیا بتاؤں اس میں کھلونے بھرے پڑے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک کھلونے موجود ہیں۔ میرے پاس تو ایک کھلونا بھی ان جیسا نہیں' ایک گڑیا بھی ان جیسی نہیں' آپ مجھے بھی ان جیسے کھلونے لا دیجئے نا"۔

"میں اپنی بیٹی کے لیے کل ایک اچھی سی گڑیا لاؤں گا پھر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایک اچھا سا کھلونا لاتا رہوں گا۔ اس طرح آپ کی الماری بھی ایک دن کھلونوں سے بھر جائے گی"۔

"ابو آپ کتنے اچھے ہیں"۔

وہ خوش ہو گئی' اپنے بازو ان کے گلے میں ڈال کر جھول گئی۔ ابو نے اس کے گال پر پیار سے ایک چپت لگائی اور پھر تینوں مسکرانے لگے۔

دوسرے دن اس کے ابو ایک گڑیا لائے۔ گڑیا اچھی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی خالدہ کی۔ اس کو دیکھ کر عائشہ کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "یہ کیا ابو! یہ آپ کیسی گڑیا لے آئے"۔

"کیوں بیٹی! کیا ہوا"۔

"ٹھہریے! میں آپ کو خالدہ کی گڑیا لا کر دکھاتی ہوں"۔

یہ کہتے ہی وہ گھر سے نکل گئی' اس کے ابو ارے ارے ہی کرتے رہ گئے۔ خالدہ کا گھر نزدیک ہی تھا۔ جلد ہی وہ اس سے گڑیا مانگ لائی۔ اس کے ابو اور امی نے گڑیا کو دیکھا' اس کے ابو کا چہرہ اتر سا گیا' وہ فکر مند ہو گئے۔ آخر بولے:

"میری بچی! آپ فکر نہ کریں کل میں آپ کے لیے ایسی گڑیا لے آؤں گا"۔

"آپ کتنے اچھے ہیں ابو"۔

وہ ایک بار پھر خوشی سے ان کی گردن سے جھول گئی۔ دوسرے دن جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں گڑیا کا ڈبا نہیں تھا۔ عائشہ کی آنکھوں میں سوال ابھر آیا' اس نے قدرے بے چین ہو کر کہا:

"کیا ہوا ابو! آپ گڑیا لانا بھول گئے کیا"۔

"نہیں بیٹی! میں بھولا نہیں لیکن وہ گڑیا....." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"وہ گڑیا کیا؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"وہ گڑیا بہت مہنگی ہے عائشہ..... میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے"۔

"خالدہ کے ابو بھی تو آپ کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ابو..... کیا وہ آپ سے بڑے آفسر ہیں' لیکن میں نے تو سنا ہے اس دفتر میں آپ سب سے بڑے ہیں' اس لحاظ سے تو آپ کی تنخواہ زیادہ ہو گی"۔

"اس میں شک نہیں' عائشہ میری بچی..... میری تنخواہ خالدہ کے ابو سے زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود اس قدر قیمتی گڑیا خرید کر نہیں لا سکتا"۔

"آخر کیوں..... خالدہ کے ابو بھی تو لے آتے ہیں"۔

"وہ ملازمت کے علاوہ اور کئی کام کرتے ہیں' ان کی آمدنی کے کچھ اور ذرائع بھی ہیں"۔

"تب پھر آپ کیوں ان ذرائع سے اپنی آمدنی میں اضافہ نہیں کرتے ابو"۔

اس کے ابو چکرا گئے۔ اب بیٹی کو کیسے سمجھائیں۔ انہوں نے پریشان ہو کر عائشہ کی والدہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے بے بسی جھانک رہی تھی۔

"اب میں اسے کس طرح سمجھاؤں"۔

"میں بتاتی ہوں..... آؤ عائشہ میرے ساتھ"۔

ماں اسے کتابوں والے کمرے میں لے آئی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہیں کہ کس رخ سے بات کریں' کس طرح اس کی الجھن دور کریں' آخر ان کے ذہن میں بات آ گئی۔ انہوں نے کتابوں کے ریک میں سے ایک کتاب نکالی۔ چند منٹ تک اس کے ورق الٹتی رہیں پھر ایک جگہ ان کے ہاتھ رک گئے۔ وہ بولیں:

"دیکھو بیٹی! اس کتاب میں ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی مبارک زندگی کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اب میں اس میں سے ایک چھوٹا سا واقعہ پڑھتی ہوں' غور سے سنیں:

ایک روز ہمارے نبی ﷺ بھوک کی حالت میں تھے۔ گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس حالت میں آپؐ کو ایک کھجور پڑی نظر آئی۔ آپؐ نے اٹھا کر کھالی' لیکن پھر اس کھجور کی وجہ سے تمام رات پریشان رہے' کروٹیں بدلتے رہے کہ نہ جانے وہ کھجور

کیسی تھی، صدقے کی تو نہیں تھی۔

اب اس جیسا ایک واقعہ اور سنیں میری بچی!

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک غلام تھا ایک دن وہ کوئی کھانے کی چیز لایا۔ آپ نے وہ کھالی۔ بعد میں معلوم ہوا وہ کھانا جائز طریقے سے نہیں کمایا گیا تھا۔ آپ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کھانے کو قے کر دیا۔

اب ایک اور حدیث سن لیں یعنی اپنے پیارے نبیؐ کے فرمان! آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہیں۔ پاک چیزوں کو قبول کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان داروں کو بھی اس طرح حکم دیا ہے جس طرح نبیوں کو حکم دیا ہے۔ یہ کہ اے رسولوؑ! حلال رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو اور اے لوگو جو ایمان لائے ان چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔ پھر آپؐ نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا۔ وہ لمبا سفر کرتا ہے، اس کے بال غبار آلود ہیں۔ اس حالت میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھاتا ہے۔ کہتا ہے اے رب اے رب! لیکن اس کا کھانا حرام ہے اس کا پینا حرام ہے۔ حرام غذا کھاتا ہے۔ بھلا ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں حلال روزی کھانا چاہیے۔ حرام روزی سے بچنا چاہیے ورنہ اللہ تعالیٰ ہماری کوئی دعا قبول نہیں کرے گا۔ اس کی مثال اس آدمی سے دی گئی ہے جو لمبا سفر کرتا ہے یعنی روزی کمانے کے لیے دور دراز کا سفر کرتا ہے سفر کی وجہ سے غبار آلود ہو جاتا ہے، لیکن حلال روزی نہیں کھاتا اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟

اسی طرح ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کریں گے کہ جو کچھ وہ کھا رہے ہیں وہ حلال ہے یا حرام"۔

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص حرام روزی کھاتا ہے پھر اس میں سے صدقہ خیرات کرتا ہے تو اس کا صدقہ قبول نہیں کیا جاتا، اس میں سے خرچ کرتا ہے تو اس میں برکت نہیں ہوتی، اس میں سے مرتے وقت چھوڑ کر جاتا ہے تو وہ دولت آگ کی مانند ہوتی ہے۔

میری بچی! ان کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو حلال روزی کمانا اور کھانا چاہیے۔ آپ کے ابو کسی ناجائز ذریعے سے کوئی پیسہ نہیں کماتے صرف تنخواہ سے گزارا کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسروں کے بارے میں یہ سوچیں کہ فلاں کی آمدنی حلال نہیں فلاں کی آمدنی حرام ہے۔ نہیں، ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنی تنخواہ میں سے اپنے گھر کا خرچ کرنے کے بعد اس حد تک قیمتی کھلونے خرید سکتے ہیں یا نہیں! آپ کے ابو نے باقاعدہ حساب لگایا ہے وہ آپ کو اتنے قیمتی کھلونے خرید کر نہیں دے سکتے۔ خرید کر دیتے ہیں تو گھریلو اخراجات کا نظام بگڑتا ہے اس لیے میری بچی جس قسم کے کھلونے وہ آپ کو دلوا سکتے ہیں آپ انہی سے دل بہلا لیا کریں تاکہ آپ کے ابو حساب کتاب کے بعد پریشان نہ ہوں۔ آپ جانتی ہیں نا حساب کتاب کا دن کیا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہہ کر اس کی امی خاموش ہو گئیں اور سوالیہ انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"جی ہاں امی جان! حساب کتاب کا دن قیامت کے دن کو کہتے ہیں۔ اس روز ہر انسان کو اپنا اپنا حساب دینا ہے اور وہ بہت سخت دن ہو گا"۔

"بس تو پھر اپنے ابو سے ایسی فرمائش نہ کریں کہ وہ الجھن کا شکار ہو جائیں"۔

"میں پوری طرح سمجھ گئی امی جان! میں اب کبھی ایسی کوئی فرمائش نہیں کروں گی"۔

"آیئے پھر ابو کے پاس چلیں، وہ فکر مند ہوں گے"۔

دونوں ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ابو نے سوالیہ انداز میں عائشہ کی طرف دیکھا وہ مسکرا دی۔ جواب میں اس کے ابو بھی مسکرا دیئے۔ پھر عائشہ آگے بڑھی اور پیار بھرے انداز میں اپنے بازو ان کی گردن میں حمائل کر دیئے اور پر سکون آواز میں بولی:

"ابو آپ کتنے اچھے ہیں، کتنے اچھے ہیں"۔

تینوں کے چہروں پر جان دار مسکراہٹیں تیر گئیں۔

K2 تسخیر کرنے کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے 2004ء کو K2 کا سال قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دنیا بھر سے سیاح اور کوہ پیما مختلف تقریبات میں شرکت کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ یہ مضمون اسی نسبت سے خاص طور پر تحریر کیا گیا ہے۔

سید شوکت اعجاز

پہاڑ قدرت کے عظیم الشان شاہکار ہیں۔ آسمانوں سے باتیں کرتی ہوئی ان کی چوٹیاں اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی اور خلاقیت کا حیرت انگیز و دلکشا منظر اور منہ بولتا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ان پہاڑی سلسلوں کا پراسرار اور ہیبت ناک وجود کوہ پیماؤں کے لیے ہمیشہ سے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہم جو سیاح انہیں تسخیر کرنے کے لیے اپنی جان تک خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتے اور ہر گھڑی اور ہر قدم ان فلک بوس چوٹیوں کو سر کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔

کوہ پیمائی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ 1100ء کے درمیانی عرصے میں پہاڑوں کو سر کرنے کی کوششوں کا ذکر ملتا ہے جس میں یورپ کے مشہور پہاڑی سلسلے الپس (ALPS) کا حوالہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ کوہ پیمائی کی موجودہ دور کی تاریخ 18ویں صدی کے اواخر میں منظر عام پر آئی جب 1786ء میں ڈاکٹر مائیکل گبریئل پیکارڈ نے الپس کی سب سے اونچی چوٹی' 15771 فٹ بلند ماؤنٹ بلانک (Mount Blance) کو سر کیا۔ اس طرح 19ویں صدی کے وسط میں الپس پہاڑوں کی چوٹیوں پر کوہ پیمائی کی باقاعدہ ابتدا ہوئی اور یورپین خصوصاً برطانوی کوہ پیماؤں کا شوق جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ کوہ پیمائی کے اس شوق کی خاطر وہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

ابتدا میں کوہ پیمائی کو مطالعاتی اغراض کے لیے اپنایا گیا لیکن بعد میں جب یہ ایک نفع بخش ذریعہ آمدن بنتا چلا گیا تو وقت کے ساتھ ساتھ اس نے باقاعدہ ایک کھیل کی صورت اختیار کر لی۔ کوہ پیمائی کا کھیل لامحدود خطرات سے گھرا ہوا ہے اور مہم جو اس میں کسی بھی لمحے اپنی قیمتی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے تاہم مہم جوئی کی لگن اور تجسس کی انتہا کے باوصف اس کھیل کے جنونیوں میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہوئی۔ کوہ پیمائی کی باقاعدہ ایسوسی ایشن پہلے پہل برطانیہ میں قائم کی گئی اب اس کی بین الاقوامی تنظیم "یو آئی اے اے" سرگرم عمل ہے جس کا صدر دفتر سوئٹزر لینڈ میں قائم ہے۔

"کے۔ ٹو" k-2 (THE KILLER MOUNTAIN)

قدرت نے پاکستان کے شمالی خطے کو عظیم پہاڑی سلسلوں سے نوازا ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں اور کوہ پیماؤں کے لیے مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ دنیا کے عظیم ترین پہاڑی سلسلوں 'کوہ ہمالیہ' قراقرم' ہندوکش اور پامیر کے بیچوں بیچ کے ٹو (K-2) کی سر بلند چوٹی ایستادہ ہے جو ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد دوسری سب سے بلند چوٹی ہے۔ اس کی بلندی 28250 فٹ ہے۔ بیس ہزار فٹ کی بلندی تک یہ چوٹی چٹانوں پر مشتمل ہے' پھر اس سے آگے برف کے تودے یعنی گلیشیر کوہ پیماؤں کا استقبال کرتے ہیں۔ مزید آگے بڑھتے ہی k-2 برف کے ٹھوس سمندر کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایورسٹ سے صرف 778 فٹ نیچے ہونے کے باوجود اسے دنیا کی سب سے دشوار گزار چوٹی قرار دیا جاتا ہے۔ مصر کے اہراموں (GREAT PYRAMIDS) کی شکل کی طرز پر ایستادہ "K-2" چوٹی کے کئی نام ہیں۔ اسے تبتی زبان میں "کوگوری" اور بلتی زبان میں "چگوری" کے روایتی ناموں سے جانا جاتا ہے۔ ان دونوں ناموں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی "شہنشاہ کہسار" KING OF MOUNTAINS)۔ ایک طویل عرصے تک کے ٹو کو سر کرنے کی کوششوں میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں جس سے دنیا بھر میں اس ہیبت ناک اور سنگدل چوٹی کی دھاک بیٹھ گئی اور اسے کئی خطاب ملے۔ مثلاً قاتل چوٹی' وحشت ناک' درندہ صفت وغیرہ' تاہم کوہ پیما جنونیوں کے لیے اسے تسخیر کرنے کے چیلنج میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

1856ء میں برطانیہ کی رائل انجینئرز سے وابستہ لیفٹیننٹ منٹگمری نے کوہ پیمائی کا سلسلہ شروع کیا تو اسے اس دوران قراقرم کی

ست ایک نہایت بلند و بالا چوٹی نظر آئی جو سفید برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور سورج کی شعاعیں اس پر سے منعکس ہو کر آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھیں۔ اس لیے اس چوٹی کا نام "k-1" رکھا۔ اسی دوران آسمان کو چھوتی ہوئی اہرام مصر کی طرح مخروطی ایک اور چوٹی نظر آئی۔ اس چوٹی کا نام اس نے "k-2" رکھا۔ "K" کا لفظ قراقرم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ 1860ء میں کیپٹن ہنری گڈون آسٹن نے قراقرم اور بلتستانی پہاڑی سلسلوں اور وادیوں کا بغور سروے کیا۔ اسی سروے کی بدولت ان سلسلوں کے پیچ و خم اور راستوں کے خطرناک نشیب و فراز سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اس مطالعے سے کوہ پیماؤں کو مہم جوئی کے دوران کافی مدد ملی۔ انہی خدمات کے اعتراف میں "K2" کے اطراف میں واقع پہاڑی سلسلوں کو "ماؤنٹ گڈون آسٹن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

"K-2" کو سر کرنے کی باقاعدہ کوششیں 1902ء میں شروع کی گئیں' لیکن دشوار گزاری اور موسم کی خرابی کے باعث انہیں ادھورا ہی چھوڑ دیا گیا۔ 1938ء میں ڈاکٹر ہوسٹن نے سر کرنے کی کوشش کی مگر 26000 فٹ کی بلندی تک پہنچ کر ان کے لیے مزید چڑھائی ناممکن ہو گئی' چنانچہ وہ ناکام واپس لوٹے۔ اسی طرح 1939ء میں ایک امریکی جماعت نے اسے سر کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بالآخر 31 جولائی 1954ء کی شام اٹلی کے پروفیسر PROF ARDITO DESIO کی قیادت میں کوہ پیماؤں کی ایک ٹیم جس میں 12 کوہ پیما اور چار سائنسدان شامل تھے' اس خطرناک چوٹی پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس چوٹی کی ہیبت اور دشوار گزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ کو جو دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے' اس کو ڈیڑھ ہزار سے زائد کوہ پیما تسخیر کر چکے ہیں جبکہ K-2 کی مشکل ترین بناوٹ اور خطرناک چڑھائی والی' پھسلن زدہ راستوں سے معمور اس چوٹی پر ابھی تک صرف 198 کوہ پیما ہی پہنچ سکے ہیں۔ چڑھائی والے یہ راستے اس قدر دشوار گزار ہیں کہ 49 کوہ پیما پھسل کر موت کی وادیوں میں جا چکے ہیں۔

پاکستانی کوہ پیما بھی اس ناقابل تسخیر چوٹی پر سبز ہلالی پرچم لہرا چکے ہیں۔ اشرف امان پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے 1977ء میں k-2 کو سر کیا۔ نذیر صابر نے 1981ء میں یہ چوٹی سر کی تاہم انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ دنیا کی بلند ترین چوٹیاں' ایورسٹ اور کے ٹو سر کرنے والے پہلے پاکستانی ہیں ان کے علاوہ رجب شاہ اور مہربان شاہ نے بھی 1996ء میں کے ٹو کو تسخیر کیا۔

*****

کے ٹو: دامنِ کوہ

کوہ پیما شوقِ جنوں

راکاپوشی کی پہاڑیاں

کارٹون کہانی

شاہد ریاض شاہد

نرالے میاں کا نرالا گفٹ پیک!

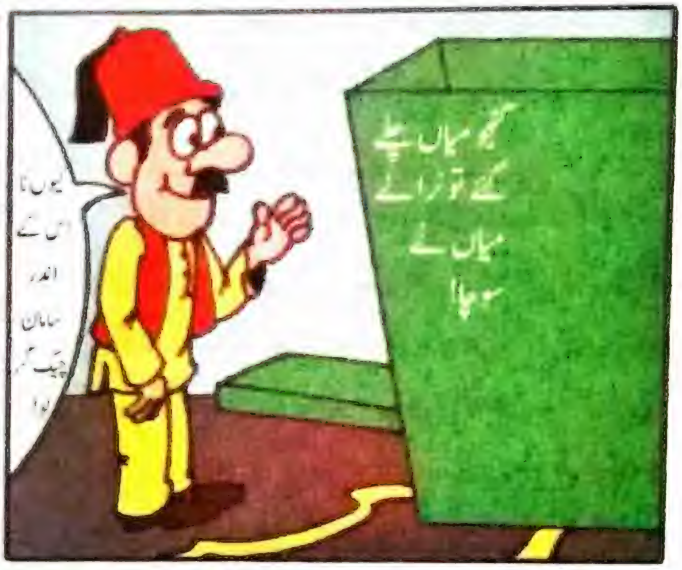

بھگوڑا شیر

جنید احمد

ڈاکٹر مارش بچپن سے ہی محنتی، رحم دل اور علم سے محبت رکھنے والے انسان تھے۔ جانوروں کے بارے میں جاننا اور انہیں پالنے کا شوق اور علم حیوانات سے لگن کے باعث صرف 25 سال کی عمر میں وہ ایک قابل ویٹ ڈاکٹر یعنی جانوروں کے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ڈاکٹر مارش کو افریقہ اور اس کے جانوروں سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر انہیں علم و تحقیق کے لیے افریقہ کے ملک کینیا جانا پڑا اور وہ اپنے مختصر کنبے، ایک بیوی اور دو ہونہار بچوں سمیت وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ کینیا آکر ڈاکٹر مارش نے ایک طویل اور سخت قانونی جنگ جیت کر شیروں اور دیگر جانوروں کے شکار پر پابندی لگوا دی۔ حکومت نے ان کے جذبے اور کام کی قدر کرتے ہوئے ان کے لیے جنگل کا بہت بڑا رقبہ مختص کر کے مارش ریسرچ سنٹر قائم کر دیا اور ڈاکٹر مارش کو کینیا کے سب سے بڑے جنگل اور اس کی جنگلی حیات کا انچارج مقرر کیا۔ ریسرچ سنٹر کے باہر ان کا گھر تھا اور اس کے ساتھ افریقی ملازمین کے کوارٹر تھے۔ ڈاکٹر مارش کے بچے بھی ان کی طرح جانوروں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ریسرچ سنٹر کے کمپاؤنڈ میں انہوں نے بہت سے جانور پال رکھے تھے۔ ان میں سب سے اہم ڈاکٹر مارش کا پالتو شیر وکٹر تھا۔ ڈاکٹر کی بیٹی، پاؤلا کو اس سے بڑی محبت تھی۔ وکٹر ان کے گھر کا فرد بن کر رہ رہا تھا۔ اسے کمپاؤنڈ میں ایک زنجیر سے باندھ کر صرف رات کو رکھا جاتا تھا۔ یہ سارا دن کمپاؤنڈ میں کسی پالتو بلی کی طرح پھرتا رہتا۔ جون 1950ء کی ایک گرم صبح کو ڈاکٹر مارش کو شہر سے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا۔ انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ شیروں کی ایک مخصوص بیماری کے جراثیم اس علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ اس بیماری میں شیر پاگل ہو کر سخت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ مزید انہیں یہ بتایا گیا کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ان تک اس مرض کی دوا کے انجکشن پہنچائے جا رہے ہیں تاکہ اس علاقے کے شیروں کو انہیں جلد از جلد لگا دیا جائے۔

ڈاکٹر مارش نے اپنے آپ کو پیش آنے والی مشکلات کے لیے تیار کر لیا اور روزمرہ کے کام میں لگ گئے۔

پاؤلا اور اس کا بھائی جیک ریسرچ سنٹر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ پاؤلا حسب معمول وکٹر کی طرف گئی۔ دونوں بہن بھائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وکٹر ابھی تک زنجیر سے بندھا ہوا ہے شاید افریقی ملازم اسے کھولنا بھول گیا تھا۔ وکٹر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے گوشت کو چھوا تک نہ تھا۔ پاؤلا نے وکٹر کو بلایا تو اس

نے خلاف معمول ان دونوں کو گھورنا شروع کر دیا اور پھر اداس سا ہو کر بیٹھ گیا۔ "میرا خیال ہے کہ وکٹر کچھ بیمار ہو گیا ہے۔ چلو ڈیڈی کو بتاتے ہیں" پاؤلا یہ کہہ کر ریسرچ سنٹر میں داخل ہو گئی۔ جیک اس کے پیچھے تھا۔ پاولا نے ڈاکٹر مارش کو وکٹر کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر مارش یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ "کیا وکٹر اس وبا کا شکار تو نہیں ہو گیا" انہوں نے سوچا۔ ڈاکٹر مارش اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وکٹر کی طرف گئے۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹی سی سرنج تھی۔ وکٹر ابھی تک بھوکا بیٹھا تھا اور اس نے ان تینوں کو دیکھ کر کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے اسے پیار کیا۔ یہ انہیں عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی چابک دستی سے سرنج وکٹر کے جسم میں داخل کر کے اس کا کچھ خون حاصل کر لیا۔ وکٹر غرا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر مارش فوراً لیبارٹری میں پہنچے اور خون کا بڑی باریک بینی سے معائنہ کیا۔ وکٹر کے خون میں اس بیماری کے جراثیم آچکے تھے اور وہ تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دونوں بچوں کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ "کیا ڈیڈی آپ وکٹر کو ہلاک کر دیں گے" پاولا نے روتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں بیٹا اس بیماری کے لیے ٹیکے جلد ہمیں مل جائیں گے۔ تاہم میں ابھی شہر جا کر ان کا فوری انتظام کرتا ہوں" وہ یہ کہہ کر باہر کی طرف لپکے۔ دونوں بچے ان کے پیچھے تھے۔ وکٹر ابھی تک اسی طرح لاتعلق سا بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے افریقی ملازم ریمبو کو آواز دی اور اسے جیپ لانے کو کہا۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر نے دونوں بچوں اور ملازموں کو ہدایت کی کہ وکٹر کا خیال رکھا جائے اس کی زنجیر بالکل نہ کھولی جائے میں زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک واپس آجاؤں گا"۔

گرمی میں اس وقت تک خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ پاولا کو وکٹر کی بڑی فکر تھی۔ تاہم دونوں گھر میں واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں گھر سے پھر نکلے تاکہ وکٹر کو دیکھیں کہ اس کا اب کیا حال ہے؟ وکٹر اسی طرح تھا اور اس کے آگے رکھا ہوا گوشت جوں کا توں پڑا تھا۔ پاولا آگے بڑھی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی: "وکٹر کیا بات ہے آج کیا ناشتا نہیں کرنا" جواب میں وکٹر زور سے دھاڑا۔ اس نے آج تک ایسا نہیں کیا تھا اور پاولا کو گھورنے لگا۔ جیک نے بڑی پھرتی سے پاولا کو پرے دھکیل دیا۔ اب وکٹر کھڑا ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وکٹر ایک بار پھر زور سے دھاڑا اور ایک جھٹکے سے اپنی زنجیر توڑ ڈالی۔ اب صرف زنجیر کا حلقہ اس کے گلے میں تھا۔ دونوں بہن بھائی خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ اس وقت تک افریقی ملازمین بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وکٹر چند لمحوں تک ان سب کو گھورتا رہا اور پھر پوری رفتار سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تیر کی طرح کمپاؤنڈ کو پار کیا اور گرجتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ "یہ پاگل ہو گیا ہے اب اسے مارنا پڑے گا"۔ جیک نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ پاولا نے پھر رونا شروع کر دیا۔ کمپاؤنڈ میں گاڑی کی آواز سن کر انہوں نے دیکھا' ڈاکٹر مارش واپس آرہے تھے۔ پاولا نے انہیں ساری بات بتا دی۔ "ہمیں اسے فوراً قابو کرنا ہے۔ بندوقیں اور ڈاٹ گنیں تیار کر لو" ڈاکٹر نے اپنے ساتھیوں براؤن اور پیٹر کو حکم دیا۔ "ڈیڈی آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ وکٹر کو نہیں ماریں گے" پاولا نے روتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر مارش نے کہا کہ وہ وکٹر کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بندوقیں حفاظت کے لیے ہم نے اپنے پاس رکھی ہیں"۔

ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک گاڑی بڑی تیزی سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ گاڑی جس پر پولیس لکھا ہوا تھا' جھٹکے سے ان کے پاس آکر رکی۔ پولیس انسپکٹر ہیڈلے بڑی تیزی سے نیچے اترا۔ "ڈاکٹر مارش تمہارا پالتو شیر کہاں ہے؟" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ ڈاکٹر کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے کہا "تمہارے شیر نے تقریباً بیس منٹ پہلے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میرے پاس ہلکی بندوق تھی اس لیے بچ گیا میں اب اسے نہیں چھوڑوں گا کیونکہ اب اس کا مارنا بہت ضروری ہے"۔ "مسٹر ہیڈلے آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ پر وکٹر نے حملہ کیا تھا؟" پاولا نے غصے سے پوچھا۔ "اس کے گلے میں زنجیر تھی اور میں وکٹر کو اچھی طرح پہچانتا ہوں" ہیڈلے نے جواب دیا۔ ڈاکٹر مارش نے ہیڈلے کو کہا کہ وہ انہیں ساری تفصیل بتائے۔ اس نے بتایا کہ وہ معمول کی گشت پر شمال کی طرف سے آرہا تھا کہ اس نے شیر کے غرانے کی آواز سنی۔ پھر اچانک وکٹر سامنے کی جھاڑیوں سے نکلا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں نے بریک لگائی اور اسے غور سے دیکھا وہ

آپ کا وکٹر تھا۔ میرے نشانہ لینے سے پہلے وہ جھاڑیوں میں غائب ہو گیا اور اب میں سیدھا یہاں آرہا ہوں۔ "مسٹر ہیڈلے شیر کے گھورنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ پر حملہ کرنا چاہتا تھا" مارش نے ہیڈلے سے کہا۔ "کچھ بھی ہو ڈاکٹر اس شیر کو قابو میں کرو اگر نہیں تو میرا یہ فرض ہے کہ اس کو ہلاک کر دوں"۔ پولیس انسپکٹر سے بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر نے اسے ساری بات بتا دی۔ یہ سن کر ہیڈلے اور اڑ گیا "اب تو اسے ہلاک کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے"۔ پاولا نے غصے سے کچھ کہنا چاہا مگر ڈاکٹر نے اسے روک دیا۔ ہیڈلے نے وائرلیس پر تھانے سے اپنے لیے ایک طاقتور شکاری بندوق منگوائی اور ڈاکٹر مارش کے ساتھ ان کی جیپ میں بیٹھ گیا۔ پاولا اور جیک نے ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ ان دونوں نے وعدہ کیا کہ وہ دونوں گاڑی میں رہیں گے اور ان کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر نے ان دونوں کو ساتھ لے لیا۔ ان کی جیپ بڑی تیزی سے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔

اب مشرق سے ہوا چلنی شروع ہو چکی تھی اور بادل آرہے تھے۔ "اگر بارش شروع ہو گئی تو ہمارا کام بہت مشکل ہو جائے گا"۔ ڈاکٹر نے پریشانی سے کہا۔ راستہ کچا تھا اور درخت اور جھاڑیاں یہاں بہت کم تھیں۔ انہیں زنجیر کا نشان مٹی پر واضح نظر آرہا تھا۔ یہ نشان ایک بڑے قطعے پر جو کہ بڑا سرسبز اور گھنا تھا غائب ہو گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ شیر وہیں تھا۔ ڈاکٹر نے جیپ روک دی۔ دونوں بچوں اور افریقی ملازم کو گاڑی میں رہنے کی تاکید کی اور ہیڈلے کے ساتھ جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل کا یہ حصہ خاصا گھنا تھا۔ جھاڑیاں اور درخت یہاں بڑے بڑے تھے۔ ہیڈلے اور ڈاکٹر کو اس جگہ کا پتا تھا کہ یہاں اکثر شیر پائے جاتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر غاریں بھی تھیں۔ آسمان اب بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور تقریباً اندھیرا چھا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ہیڈلے کو دائیں طرف بھیجا۔ "مسٹر ہیڈلے آپ اس طرف سے جائزہ لیں میں بائیں طرف جاتا ہوں اور برائے مہربانی بغیر سوچے سمجھے فائر مت کریں اور یہ ڈاٹ گن اپنے پاس رکھیں اس سے بے ہوش کرنے والی سوئی جانور کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہے"۔ "مجھے پتا ہے" یہ کہہ کر ہیڈلے نے گن لے لی اور دائیں طرف مڑ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ڈاکٹر بائیں طرف کے جھنڈ میں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے ڈاٹ گن ایک طرف پھینکی۔ اپنی طاقتور گن لوڈ کی اور آگے بڑھا۔ اس نے وکٹر کو ہلاک کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں خاصا اندھیرا تھا۔ اس نے اچانک ایک غراہٹ سنی۔ آواز سامنے کی جھاڑیوں سے آرہی تھی۔ اس نے بندوق تیار حالت میں رکھی اور بڑی آہستگی سے آگے چلا۔ ایک دم سے اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ ایک پندرہ فٹ گڑھے میں بڑے زور سے گرا اس گڑھے کو بڑی مہارت سے شاخوں اور پتوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ایسے گڑھے جانوروں کو قابو کرنے کے لیے مقامی لوگ جنگل میں اکثر کھودتے رہتے تھے۔ ہیڈلے کے ہاتھ سے بندوق گر گئی اور اسے سخت چوٹ بھی آئی تھی۔ اس نے مقامی لوگوں کو کوسنا شروع کر دیا اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ یہ گڑھا اندر سے خاصا بڑا تھا مگر اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے لائٹر نکال کر جلایا اسے اپنی بندوق کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے گڑھے کی دیواروں کا لرزتی روشنی میں جائزہ لیا۔ ایک طرف خودرو پودے اوپر تک جا رہے تھے۔ اس نے انہیں کھینچ کر دیکھا۔ یہ بہت مضبوط شاخیں

تھیں۔ "میرا خیال ہے کہ میں پہلے یہاں سے نکلوں اور مارش کو آواز دے کر بلاؤں"۔ یہ سوچ کر ہیڈلے نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس نے کچھ دیر پہلے غراہٹ سنی تھی۔ اب بجلی کڑک رہی تھی۔ ہیڈلے تقریباً ڈیڑھ یا دو منٹ کے بعد کنارے پر آیا اور باہر جھانکا۔ اسے اسی وقت سامنے سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں اور اندھیرے میں سے کوئی چیز اس پر جھپٹی۔ اس نے فوراً کنارے چھوڑ دیئے اور گڑھے میں گر گیا۔ اس نے اوپر دیکھا تو خوف سے اس کا سانس رک گیا۔ شیر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح اپنی بندوق تلاش کرنا شروع کر دی۔ شیر اب اس پر چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہیڈلے کو بندوق نہیں مل رہی تھی اور موت اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اچانک اسے ایک اور غراہٹ سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ اور شیر بھی ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ شیروں میں گھر گیا ہے۔ اب اس کی موت یقینی ہے! شیروں کی دھاڑوں سے اس کا پتہ پانی ہو گیا۔ اوپر سے بجلی کڑک رہی تھی۔ آوازوں سے لگتا تھا کہ دو شیر آپس میں لڑ رہے ہیں۔ "دونوں میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہو گا کہ اکیلا مجھے کھائے"۔ ہیڈلے نے کانپتے ہوئے سوچا۔ اس نے پھر لائٹر جلایا اور گڑھے میں اپنی بندوق تلاش کرنے لگا۔ آخر وہ اسے ایک کونے میں مٹی میں دھنسی ہوئی نظر آگئی۔ اوپر لڑائی جاری تھی اب ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ ہیڈلے نے بندوق لی اور گڑھے سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ "میں دونوں کو مار دوں گا اور میرا یہ کارنامہ میری ترقی کا باعث ہو گا"۔ یہ سوچ کر اس نے کندھے سے بندوق لگائی اور تیزی سے اوپر لپکا۔ اس نے کنارے کو پکڑا اور اچھل کر گڑھے سے باہر آگیا۔

دو شیر ماہر پہلوانوں کی طرح ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے تھے۔ ایک شیر کے گرد زنجیر تھی۔ دوسرا شیر اس سے کہیں بڑا اور طاقتور تھا۔ مگر زنجیر والا شیر جو یقیناً وکٹر تھا بڑی دلیری سے لڑ رہا تھا۔ ہیڈلے کے نشانہ لے کر فائر کرنے سے پہلے وکٹر نے تابڑ توڑ حملے کر کے دوسرے شیر کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وکٹر نے اپنے مخالف کو بھگا کر زوردار دھاڑ ماری۔ عین اس وقت ہیڈلے نے اس کے سر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبایا۔ کھٹ کی آواز آئی بندوق جام ہو چکی تھی۔ وکٹر نے اب ہیڈلے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ہیڈلے خوف سے مفلوج ہو گیا تاہم اس نے ایک بار پھر ٹریگر دبایا مگر نتیجہ وہی۔ وکٹر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر وہ اس کے بالکل نزدیک آگیا۔ بارش اب تیز ہو چکی تھی۔ ہیڈلے نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وکٹر نے اپنا دایاں پاؤں اس کے گھٹنے پر رکھا اور اسے پیار کرنے لگا۔ ہیڈلے نے آنکھیں کھول کر حیرت سے دیکھا۔ وکٹر اب اسے بالکل پالتو بلی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ دائیں طرف جھاڑیاں ہلیں اور ڈاکٹر مارش، پاؤلا اور جیک آگے آئے۔ وکٹر نے پاولا کو مڑ کر دیکھا اور اس کے پاس بڑے پیار سے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہیڈلے نے ایک بار پھر بندوق چلانے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی اسے ناکامی ہوئی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس سے بندوق چھین لی۔ "مسٹر ہیڈلے کیا آپ اسے اس لیے مارنا چاہتے ہیں کہ اس نے آپ کو دوسرے شیر کا کھاجا بننے سے بچایا ہے" پاولا نے غصے سے کہا۔ "اس ذلیل جانور کو یہاں سے لے جاؤ مجھے اس کا کوئی اعتبار نہیں"۔ ہیڈلے نے چیخ کر کہا "اور مجھے تمہارا کوئی اعتبار نہیں" ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔

بارش میں تیزی آنا شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے وائرلیس پر ریسرچ سنٹر سے بڑا ٹرک منگوایا۔ وکٹر کو سرنج لگا کر بے ہوش کر دیا گیا۔ ہیڈلے نے ڈاکٹر سے شرمندہ ہوتے ہوئے پوچھا "آپ مجھ تک کیسے پہنچے؟ شیروں کی دھاڑوں سے ہمیں ایسا لگا کہ شاید آپ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ مگر بجلی کی کڑک سے ہمیں سمت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ راستے میں ہم نے ایک شیر کو بجلی کی سی تیزی سے بھاگتے دیکھا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس نے ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔ پھر ہمیں وکٹر کی دھاڑ سنائی دی۔ ہم نے سب کچھ دیکھ لیا کہ تم اسے مارنا چاہتے تھے مگر بندوق نہیں چلی اور اس نے تمہیں پیار کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ٹرک آگیا وکٹر کو اس میں ڈالا گیا اور سارے لوگ ریسرچ سنٹر پہنچ گئے۔ شام تک انجکشن ریسرچ سنٹر پہنچ گئے۔ وکٹر کو فوراً انجکشن لگایا گیا اب وہ محفوظ تھا۔ اگلے دو تین دن تک اس علاقے کے تقریباً بیس شیروں کو فرداً فرداً بے ہوش کر کے انجکشن لگائے گئے۔

ڈاکٹر مارش نے یقیناً اس ساری مشکل پر قابو پا لیا تھا۔

آج کل بچے بستے میں
کتابیں کم اور ہمیں
زیادہ رکھتے ہیں!
شاہد ریاض شاہد
جن انکل! کیا آپ ہمارے
ماسٹر جی کا ڈنڈا غائب کر
کر سکتے ہیں؟
ایک ایسا خطرناک کیڑا جس نے
تعلیم کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے!
بوٹی مافیا
معیارِ تعلیم

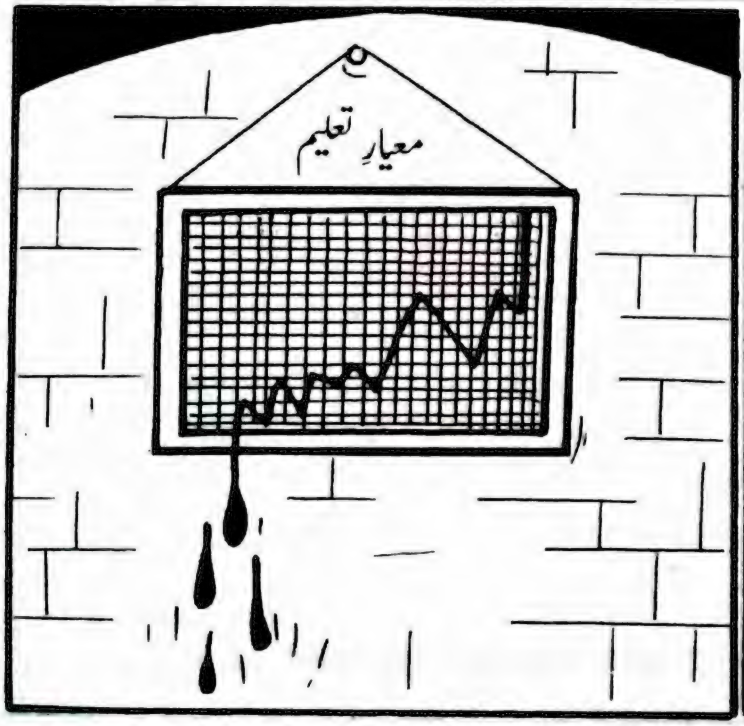

مجرم کون؟

مجرم کا کھوج لگائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2004ء

مجرم کون؟

نام: _____

پورا پتا: _____

_____

_____

انسپکٹر زاہد نے گھر کے تالاب میں کچھ قیمتی اور نادر مچھلیاں پال رکھی تھیں۔ ایک روز انہوں نے تفتیش کے لیے دو مجرموں کو گھر بلوایا۔ قیمتی مچھلیاں دیکھتے ہی ان کی نیت میں فتور آ گیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو شاپنگ بیگ میں مچھلیاں ڈال کر بھگا دیا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر زاہد آئے تو انہیں کچھ شک گزرا۔ مچھلیاں غائب تھیں مگر مجرم صاف انکار کر رہا تھا کہ میرا کوئی قصور نہیں' مچھلیاں تو دوسرا لے اڑا ہے۔ مگر انسپکٹر زاہد کو پتا چل گیا کہ اسی کی ساری کارستانی ہے۔ کیا تصویر دیکھ کر آپ بتا سکتے ہیں کہ انہیں کیسے پتا چلا؟

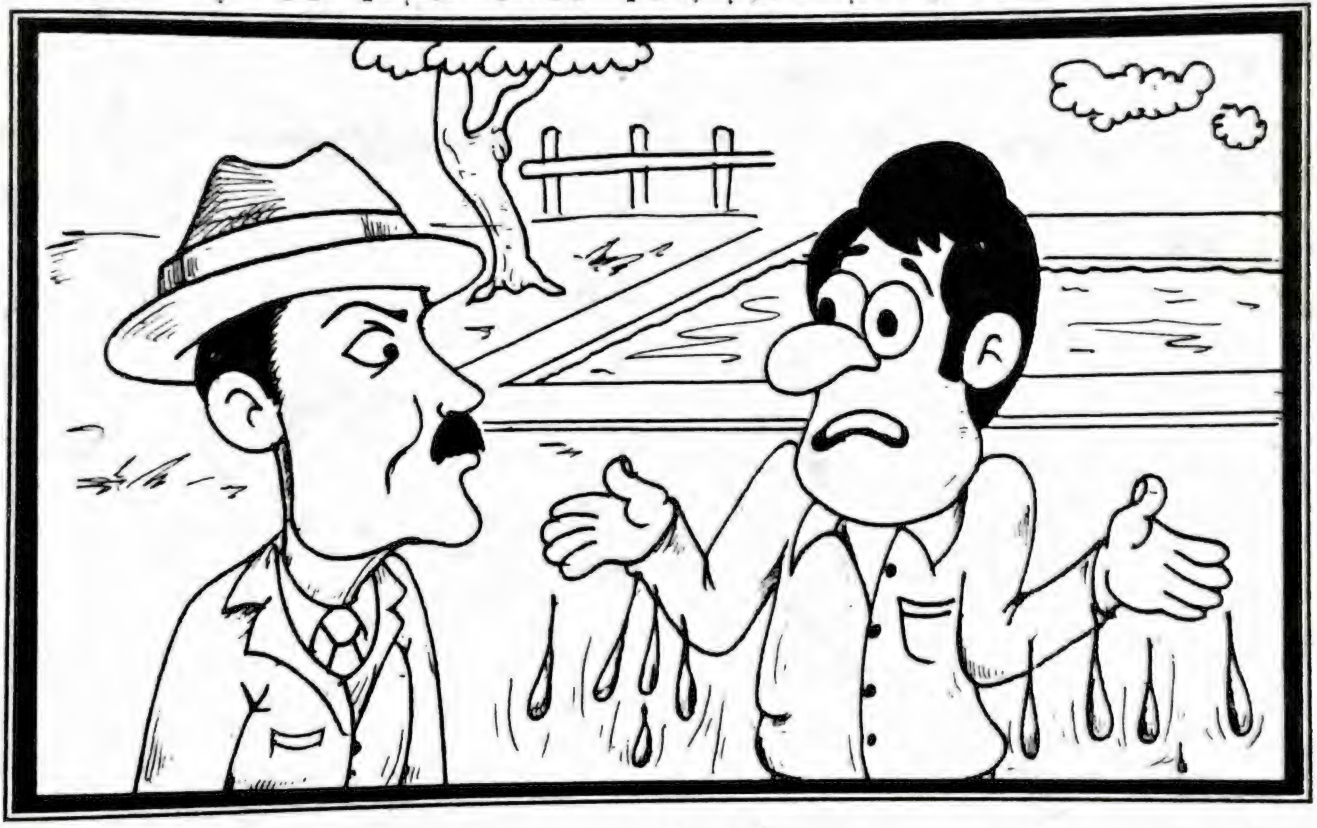

اگست 2004ء میں شائع ہونے والے "مجرم کون؟" کا صحیح حل: انسپکٹر زاہد نے جب دیکھا کہ ٹیپ ریکاڈر کی تار لگی ہوئی ہے تو انہوں نے کھسک کر اپنے پاؤں سے بٹن دبایا اور ٹیپ ریکارڈ کو آن کر دیا۔ اس طرح اس کی آواز سے ان کے ساتھیوں کو شبہ ہوا اور انہوں نے کمرہ کھول کر انسپکٹر زاہد کو رہائی دلائی۔

یہ جواب اس دفعہ ہزاروں بچوں نے ارسال کیا' جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50' 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

(1) محمد کاشف' ڈیرہ غازی خان (2) محمد عمران جڑانوالا (3) سید علی حمزہ لاہور (4) ماجد ظہیر راولپنڈی (5) تحریم نائیک فیصل آباد (6) محمد فاروق خالد لاہور (7) ماریہ شہزاد اسلام آباد (8) محمد مظہر لون مظفر آباد (9) نازیہ بی بی اسلام آباد (10) محمد عبداللہ گوجرانوالہ۔

جانور کہانی

حسن ذکی کاظمی

جانوروں کی پکنک

صدر جلسہ نے تو مہمانوں سے کہا تھا کہ فواروں کے پانی سے تازہ دم ہو جایئے اور کچھ کھا پی لیجئے۔ لیکن مہمانوں نے لفظ کچھ پر بالکل توجہ نہ دی۔ بقول وفادار ایسا گھمسان کارن پڑا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ پرندے بے چارے تو دانے دنکے تک رہے۔ چوہوں اور گلہریوں وغیرہ نے بھی چند ٹکڑوں پر گذارا کیا لیکن بڑے جانور تو کھانے پر ایسے ٹوٹے جیسے شادی بیاہ میں انسان ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وفادار بھلا کیوں کسی سے پیچھے رہتا۔ بہادر نے لاکھ ٹوکا اور لعن طعن کی لیکن وہ یہی کہتا رہا۔

"میرے یار کل کا کیا بھروسہ۔ بس آج دل کی حسرت نکل جانے دے"۔

منگلو اور سیانا دونوں وفادار کے ان جملوں کی وجہ سے ڈر گئے تھے جو اس نے دوپہر کے کھانے کے وقت کہے تھے۔ وہ وفادار کو خوش رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ پھکڑ پن سے باز رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے حد مصروفیت کے باوجود ٹہلتے ٹہلتے اس طرف آئے جہاں وفادار پرات میں تھوتھنی ڈالے دنیا سے بے خبر تھا۔ منگلو اور سیانے نے ہائے کہا تو وہ گھبرا کر ایسے چونکا جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ سیانے نے فقرا چست کیا۔

"بھائی وفادار' تکلف نہ کرنا۔ دیگیں بھری پڑی ہیں"۔

بہادر نے قہقہہ لگایا اور بولا "پرواہ نہ کرو۔ سب خالی ہو جائیں گی۔ اللہ ہمارے یار کو سلامت رکھے"۔

وفادار جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کی نظر ایک نہایت بدشکل اور ڈراؤنے کتے پر پڑی جو اپنے سر پر تاج سجائے منگلو اور سیانے کے درمیان کھڑا تھا۔ وفادار نے اسے دیکھ کر بہادر کو آنکھ ماری اور کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ پھڑکے۔

بہادر نے بھانپ لیا کہ وفادار اب کوئی بے ڈھب جملہ کہنے والا ہے لہٰذا اس نے بات ٹالنے کے لیے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منگلو اور سیانے سے پوچھا "آپ کی تعریف؟"

منگلو نے اپنی دھوپ کی عینک جو وہ شام ہو جانے کے باوجود بڑی مستعدی سے لگائے ہوئے تھا اتار کر کوٹ کی جیب میں رکھی اور پنجے سے گال کھجاتے ہوئے بولا:

"لو باتوں میں تعارف کرانا یاد ہی نہ رہا۔ آئی ایم سوری! ہاں تو یہ ہیں مسٹر بلی عمر دس سال ہے اور ان کا تعلق بھی برطانیہ سے

ہے" وفادار نے بات کاٹی۔

"اور یہ تاج؟"

اس سوال سے منگلو اور سیانا دونوں کچھ پریشان ہو گئے۔ بلی نے ان کی پریشانی بھانپ لی اور بولا:

"بھائی یہ دونوں اصل بات بتاتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔ میں خود اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں..... ہوا یہ کہ چند سال پہلے لندن کے علاقے رچ منڈ میں کتوں کے مقابلہ حسن کے دوران میری مالکہ نے میرا نام بھی لکھوا دیا۔ مقابلے کے منصفوں نے کتوں کو جانچنا شروع کیا۔ میری باری آئی تو وہ سب حیران رہ گئے۔ دو بڑے بڑے دانت ڈریکولا کی طرح باہر نکلے ہوئے کانوں میں بالوں کا جنگل اُگا ہوا اور ہر طرف جھریاں ہی جھریاں۔ منصفین مجھے دیکھ کر یقیناً مایوس ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے میری مالکہ کو مایوس نہیں کیا۔ انہوں نے میرے سر پر تاج رکھا اور مجھے خطاب بھی دیا..... وہ خطاب تھا' برطانیہ کا بدصورت ترین کتا' کہیے کیسی رہی؟"

یہ کہہ کر بلی ہف ہف کر کے ہنسا اور بہادر اور وفادار کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا داد طلب کر رہا ہو۔ چار و ناچار ان دونوں کو اس کی ہف ہف میں اپنی ہنہناہٹ شامل کرنا پڑی۔ چند لمحوں بعد بلی نے ہنسی پر قابو پا کر مزید بتایا۔

"میری مالکہ نے رحم کھا کر مجھے انسداد بے رحمی حیوانات کی تنظیم سے لیا تھا۔ پھر یہ رحم کا جذبہ ایسی زبردست محبت میں تبدیل ہوا کہ وہ میرا بے حد خیال رکھنے لگی اور اب تو وہ کہتی ہے کہ کسی قیمت پر مجھے کسی کو نہیں دے گی۔ ہف ہف ہف....."

بہادر نے ذرا حیران ہو کر پوچھا "اچھا تو اسی لیے آپ کو نمائندہ بنا کر کانفرنس میں بھیجا گیا ہے کہ آپ....."

بلی نے بات کاٹی "نمائندہ وائندہ کوئی نہیں۔ مجھے تو میری مالکہ نے اپنے خرچ پر بھیجا ہے کہ میں بھی ذرا یہ رونق دیکھ لوں اور بھانت بھانت کے جانوروں سے مل لوں۔ اس کا خیال ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی سے میری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا"۔

بلی نے بات ختم کی تو منگلو بولا "اصل بات بلی نے بتائی ہی نہیں اور وہ یہ کہ ان کی مالکہ اور ایک اشتہاری کمپنی کے درمیان معاہدہ ہوا ہے اور جلد ہی اس معاہدے کے تحت بلی صاحب ایک ماڈل بن جائیں گے۔ پھر دیکھنا ان کی شہرت"۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چراگاہ میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ جانوروں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کیا۔ جس کے سینگ جدھر سمائے وہ ادھر نکل گیا۔ افراتفری کچھ کم ہوئی تو پتا چلا کہ کسی بچے نے شرارت سے ایک کتے کی دم میں پٹاخوں کا فیتہ باندھ کر اسے ماچس دکھا دی تھی۔ پٹاخے ایک ایک کر کے پھٹنے لگے تو کتا بوکھلا کر چراگاہ میں آ گیا۔

دوسرے دن کانفرنس کا اجلاس شروع ہوتے ہی اس ظالمانہ حرکت کے خلاف قرار داد منظور کی گئی اور اسے جانور برادری کے خلاف ایک سازش قرار دیا گیا۔ ایک نمائندے نے اس فرق کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی جو مغربی ممالک میں کتوں اور دوسرے جانوروں سے حسن سلوک' اور ہمارے ملکوں میں ان سے بدسلوکی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ فوراً یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جلسہ گاہ میں سیکورٹی سخت کر دی جائے۔ سیکورٹی کے انتظام میں پہلے کتے شامل تھے لیکن اب اس میں بیوٹی نام کی ایک گلہری اور سوئٹی نام کی ایک شہد کی مکھی کو بھی شامل کر لیا گیا۔ کتوں کے بارے میں تو سب جانتے

تھے کہ ان کا حفاظتی انتظامات سے گہرا تعلق ہے لیکن یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گلہری اور شہد کی مکھی کو اس کام کے لیے کیوں چنا گیا۔

یہ راز بعد میں کھلا کہ بیونی گلہری کوئی عام گلہری نہیں۔ اس کا تعلق انگلستان کے شہر باتھ سے ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دن باتھ میں چور ایک گھر سے ایک ڈبہ چرا لے گئے جس میں قیمتی چیزیں تھیں۔ اس ڈبے کو انہوں نے ایک درخت کے نیچے چھپا دیا۔ پولیس والے اسے تلاش کرتے کرتے تنگ آگئے تو انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ اتنے میں ایک گلہری ان کے قریب آکر اس طرح پھدکنے لگی کہ سب کی توجہ اس کی طرف چلی گئی۔ پھر گلہری نے ایک سمت میں دوڑنا شروع کیا۔ وہ تھوڑا سا دوڑتی اور پھر رکنے کے بعد پلٹ کر دیکھتی جیسے پولیس والوں کو بلا رہی ہو۔ پولیس والوں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ آخر گلہری نے انہیں اس درخت تک پہنچا دیا جہاں ڈبہ چھپا تھا اور پھر اچھل اچھل کر وہ جگہ بھی بتا دی جہاں ڈبہ رکھا گیا تھا۔ پولیس والے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں اس کا نام بیونی پڑ گیا اور اس نے باقاعدہ جاسوسی کا کام شروع کر دیا۔

بیونی گلہری کی طرح سوئی شہد کی مکھی بھی ایک خاص مکھی ہے۔ یہ ان شہد کی مکھیوں میں سے ایک ہے جنہیں ایک امریکی یونیورسٹی میں بارودی سرنگوں اور آتش گیر مادے کو سونگھ کر کھوج لگانے کی تربیت دی گئی ہے۔ وہاں کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ شہد کی مکھی یہ کام کتوں سے بہتر طریقے سے کر سکتی ہے کیونکہ اس میں بارودی مادے کو سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔

کانفرنس تیسرے دن خیریت سے ختم ہوئی اور انسانوں اور جانوروں نے اسے بہت کامیاب قرار دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُمید سے زیادہ کامیابی ہوئی جس کا سہرا منگو اور سیانے کے سر بندھا۔ جانوروں کے حقوق اور ان سے اچھے سلوک کے بارے میں قرار دادیں منظور ہوئیں، تعاون کرنے والی تنظیموں کا شکریہ ادا کیا گیا اور آئندہ کانفرنس کا پروگرام بنایا گیا۔ جانوروں کے کچھ نمائندے تو اپنی مصروفیت کی وجہ سے کانفرنس ختم ہوتے ہی روانہ ہو گئے لیکن کچھ نے سیر و تفریح کی غرض سے رکنے کا پروگرام بنالیا۔

موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انتظامی کمیٹی نے معزز مہمانوں کے لیے ایک پکنک کا اہتمام کیا۔ اس پکنک کے میزبان اس فارم کے مالک تھے جہاں بہادر اور وفادار رہتے تھے۔ یوں تو اس فارم میں کئی طرح کے جانور رہتے تھے لیکن آج اس کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی نئے انداز کا زو (چڑیا گھر) ہے جس میں جانوروں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کے بجائے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ بہادر اور وفادار انتظام اور میزبانی میں آگے آگے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی بھی مہمان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ کانفرنس کے بعد سیانے اور منگو کا شمار معتبر جانوروں میں کیا گیا تھا لہٰذا اب انہیں وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا جا رہا تھا یعنی اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور گفتگو میں انہیں خاص اہمیت دی جا رہی تھی۔

باتوں باتوں میں کسی نے پوچھ لیا کہ جانوروں کو زو میں رکھنے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ اس اچانک سوال پر سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور خاموشی چھا گئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ چند مہینے پہلے سیانے نے اپنے تویلے میں اسی موضوع پر کسی کتاب کے حوالے سے اسکول کے دو بچوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ ان میں سے کچھ نکتے اس کے دماغ میں تھے۔ مہمانوں پر رعب ڈالنے کا اس سے اچھا موقعہ بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

سیانے نے دائیں بائیں دیکھ کر زور سے جھرجھری لی۔ جیسے تھکن اتار رہا ہو اور پھر بولنا شروع کیا۔

"پڑھے لکھوں اور تجربہ کاروں کا مجمع ہے۔ بڑے بڑے ملکوں سے آئے ہوئے جانوروں کی محفل ہے۔ میں تو بس نام کا سیانا ہوں۔ لیکن پڑھے لکھوں کی باتیں کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں"۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں ہاں ضرور ہم بہت شکر گزار ہوں گے"۔

سیانے نے کچھ اس انداز سے گردن جھکا کر آنکھیں بند کیں جیسے کچھ سوچ رہا اور یاد کر رہا ہو۔ چند لمحے بعد گردن اوپر اٹھی، آنکھیں کھلیں اور بے ڈھب مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی۔ پھر اس نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھ کر بولنا شروع کیا "سنا ہے کہ

آج سے کوئی تین ہزار سال پہلے چین کے حکمرانوں نے چڑیا گھر بنائے تھے جنہیں انہوں نے ذہانت یا عقل و فہم کے باغوں کا نام دیا تھا۔ اس کا مطلب غالباً یہ ہو گا کہ جانوروں کو غور سے دیکھنے اور ان کی حرکتوں کا مشاہدہ کرنے سے انسان کی عقل و فہم بڑھتی ہے..... چلئے کہیں تو انسان نے ہمارا احسان مانا" یہ کہہ کر سیانے نے فوں فوں کر کے نقلی ہنسی ہنسنے کی کوشش کی جس میں سارے جانوروں نے اپنے اپنے طریقے سے اس کا ساتھ دیا۔ بات جاری رکھتے ہوئے سیانے نے کہا۔

"یا پھر اس لیے چڑیا گھر کو عقل و فہم کا باغ کہتے ہوں گے کہ وہاں رہنے والے یعنی جانور عقل و فہم کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں"۔

مہمانوں نے سیانے کی اس بات کی پر زور تائید کی اور ہر طرف سے "بے شک بے شک" کی آواز بلند ہوئی۔ اس تعریف سے سیانے کی گردن اکڑنا شروع ہوئی اور اس نے آواز میں ذرا رعب پیدا کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"رفتہ رفتہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی چڑیا گھر بنائے گئے اور اب تو تقریباً دنیا کے ہر بڑے شہر میں چڑیا گھر ملتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ ہوتا تھا کہ بعض جانوروں مثلاً ہاتھی، بندر اور ریچھ وغیرہ کو کچھ کرتب سکھا دیئے جاتے تھے تاکہ وہ آنے والے تماشائیوں کو خوش کریں۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ ختم ہوتا گیا۔ اب چڑیا گھر کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو قدرتی ماحول میں جانوروں کی زندگی اور حرکات کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اب جانوروں کو رکھنے کے لیے بڑے بڑے سفاری پارک بنائے جا رہے ہیں جہاں وہ قدرتی ماحول میں زندگی گزارتے ہیں اور انسان ان کے طور طریقوں کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔ بڑے بڑے چڑیا گھر اور سفاری پارک کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ایسے جانوروں کی حفاظت کی جائے اور ان کی تعداد بڑھائی جائے جن کی نسل اب ختم ہو رہی ہے۔ لیکن انسانوں میں بہت سے لوگ چڑیا گھر بنانے کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک نہیں کہ جانوروں کو اس طرح قید میں رکھا جائے اور تماشہ بنایا جائے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ چڑیا گھر ہو یا سفاری پارک۔ جانوروں کو صحیح قدرتی ماحول نہیں مل سکتا۔ خراب غذا ملتی ہے جو اکثر ناکافی ہوتی ہے۔ گندگی پھیلی رہتی ہے اور جانور خوف کی وجہ سے ذہنی دباؤ میں رہتے ہیں"۔

سیانا بے تکان بولے جا رہا تھا۔ وفادار انتظام میں لگا تھا لہٰذا اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی اس کی بات کی مخالفت کرے گا یا پھکڑ پن کرے گا۔ ابھی وہ اور بولتا لیکن سامنے سے بہادر اور وفادار کی نگرانی میں کچھ جانور سینڈوچ اور مشروبات کی ٹرالیاں لیے میدان میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی اور سیانے کو خاموش ہونا پڑا۔ لیکن سینڈوچ اور مشروب کا مزا لینے کے ساتھ ساتھ مہمانوں نے سیانے کے علم و ذہانت کی دل کھول کر تعریف کی ہر جانور پر سیانے کی جنرل نالج کا رعب جم گیا تھا اور بعض کا اصرار تھا کہ سیانے سے کچھ اور علمی گفتگو سنی جائے۔ لیکن بھلا ہو جرمنی سے آئی ہوئی لومڑی 'فرینڈلی' کا جس نے گفتگو کا رخ موڑ دیا وہ کہنے لگی۔

"دوستو! پکنک کا موقعہ ہے۔ کچھ ہلکی پھلکی باتیں کرو۔ کچھ ہنسی مذاق کرو۔ کوئی لطیفہ سناؤ' کوئی قصہ کہانی سنا دو۔ یہ بھلا علمی باتوں کا وقت ہے؟ اور پھر علمی باتیں بھی ایک....." فرینڈلی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ لیکن سننے والے سمجھ گئے کہ ایک کے آگے وہ

کیا کہنے والی تھی۔ سیانا گھسیانا ہو گیا۔ بس چلتا تو فرینڈلی کو کچا ہی چبا جاتا لیکن شرمندگی مٹانے کو مسکرا کر بولا۔

"تو محترمہ آپ ہی شروع کر دیجئے کوئی قصہ کہانی' کوئی لطیفہ' کوئی ہنسی مذاق..... مہمانوں کا موڈ خوشگوار بنانے کے لیے"۔

سب نے تائید کی اور فرینڈلی نے شرماتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

جانور بے چارے تو کاٹ کھانے کے معاملے میں ہمیشہ سے بدنام ہیں۔ انسان شروع سے ہی اپنے بچے کو جانور سے ڈراتے ہیں اسے چھونا نہیں کاٹ لے گا۔ اس کے پاس نہ جانا کاٹ لے گا' اور یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے۔ لیکن جناب اب لگتا ہے کہ انسان اس معاملے میں بھی جانور سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ شہر میونخ میں جہاں میرا گھر ہے وہاں ایک ریسٹورنٹ میں عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک مرد نے جو نشے میں دھت تھا بجائے فرش کے میزوں پر رقص کرنا شروع کر دیا۔ ناچتے ناچتے وہاں ایک عورت کی میز پر جا پہنچا۔ عورت کو جو غصہ آیا تو اس نے اس کی پنڈلی پر کاٹ لیا اور اس کے کاٹنے سے ڈیڑھ انچ لمبا زخم آیا۔ دوسرے دن تو میاں جی کی حالت بگڑ گئی۔ ایک سو چھ ڈگری بخار چڑھ گیا' جلد چٹخنے لگی اور شدید درد ہونے لگا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ الٹرا ساؤنڈ اور دوسرے ٹسٹ ہوئے تو پتا چلا کہ عورت کے کاٹنے سے اس کے جسم میں ایسا زہریلا مادہ سرایت کر گیا ہے جو گوشت کو گلا سڑا دے گا اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹروں نے بڑے جتن کر کے اس کی جان تو بچالی لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اب جانوروں کے بجائے انسانوں سے جان بچاتا پھر رہا ہے..... ہاہاہا....."

فرینڈلی نے تو بڑے مہذب انداز میں ہاہاہا کی لیکن سننے والوں نے زور دار قہقہہ لگایا۔ ایک کونے سے آواز آئی "اچھا لطیفہ ہے"۔

فرینڈلی نے ذرا ناگواری سے کہا "جی نہیں..... یہ لطیفہ نہیں ایک سچی بات ہے۔ یہ رپورٹ کچھ دن پہلے مشہور طبی رسالے لانسٹ میں چھپی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اس زہریلے مادے سے جسمانی اعضاء بھی ناکارہ ہو سکتے تھے۔ رپورٹ میں ڈاکٹروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ انسان کا کاٹا عموماً جانور کے کاٹے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ انسان کے منہ میں برے بکٹیریا کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے"۔

بدصورت ترین' کتے' بلی' نے اپنے دو باہر نکلے ہوئے دانتوں کو منہ میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لو تو ہم مفت میں بدنام ہیں..... ہف ہف ہف"

حاضرین بھی اس ہنسی میں شامل ہو گئے..... کافی دیر تک ہنسی مذاق اور قصے کہانیوں کی یہ محفل جمی رہی جس کا باقی حال آپ آئندہ سنیں گے۔

(باقی آئندہ)

مہکتی کلیاں

☆ جو اچھی بات سنو اسے لکھ لو' جو لکھو اسے یاد کرو جو یاد کرو اسے بیان کرو!

☆ خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے لیکن سیرت قبر تک جاتی ہے!

☆ جب جسم کو آخر کار موت ہی آنی ہے تو راہ حق میں شہید ہونا سب سے بہتر ہے۔

☆ یہ نہ دیکھو کہ بات کس نے کی ہے یہ دیکھو کہ بات کیسی کہی ہے!

☆ غلطی کرنا انسانی فطرت اور غلطی کرنے والے کو معاف کر دینا خدائی صفت ہے!

☆ زبان کے خنجر سے کسی کو زخمی مت کرو!

☆ خوف کا نتیجہ ناکامی اور شرم کا نتیجہ محرومی ہے۔ فرصت کی گھڑیاں ابر کی طرح گزر جاتی ہیں۔ لہٰذا بھلائی کے ملے ہوئے موقعوں کو غنیمت جانو۔

☆ مرض میں جب تک ہمت ساتھ دے' چلتے پھرتے رہو۔

☆ جو شخص اپنے آپ کو بہت پسند کرتا ہے' وہ دوسروں کو ناپسند ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ جس بندے کو ذلیل کرنا چاہتا ہے اسے علم و دانش سے محروم کر دیتا ہے۔

(محمد رضوان یارز' جہانیاں)

دو خیال

سلمان عرفان، کراچی

ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ خود کو برائیوں اور غلط کاموں سے دور رکھے۔ مگر لاکھ کوشش کے باوجود ہم سے کوئی نہ کوئی برا کام ہو ہی جاتا ہے۔ آیئے میں آپ لوگوں کو وہ باتیں بتاؤں جو میرے نانا جان نے مجھے بتائی تھیں کہ کس طرح ہم اپنے آپ کو برے کاموں اور غلط باتوں سے دور رکھ سکتے ہیں۔ اس کا پہلا اور آسان حل یہ ہے کہ ہم جو بھی کام کرنے لگیں سب سے پہلے یہ سوچ لیں کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کہیں اس کام کو منع تو نہیں فرمایا؟

دوسرا یہ کہ اس خیال کو بھی ذہن میں لائیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج ہم کسی کو نقصان پہنچا رہے ہیں تو کل کو کوئی دوسرا ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ بس یہ دو خیال اتنے طاقت ور ہیں کہ اگر ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب، عقیدہ اور قوم سے تعلق رکھتا ہو وہ یہ دو باتیں سوچ لے تو مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ دنیا واقعی جنت کا نظارا پیش کرے گی۔ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

سچ کی برکت

زاہد محمود، چکوال

رات کا پچھلا پہر تھا۔ دن بھر کا تھکا ہارا قافلہ پڑا سو رہا تھا۔ اچانک شور اٹھا۔ "ڈاکو آگئے ڈاکو آگئے"۔ سوئے ہوئے مسافر ہڑبڑا کر اٹھے اور اپنے اپنے سامان کو سنبھالنے لگے۔ ڈاکوؤں نے لوٹ مچا رکھی تھی۔ ایک ایک کی تلاشی لے رہے تھے لوگوں کی جیبیں ٹٹول رہے تھے جو کچھ پاتے تھے چھین جھپٹ لیتے تھے۔ لٹنے والے آہ و فغاں کر رہے تھے مگر ظالم ڈاکوؤں پر اس کا کوئی کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اسی قافلے میں ایک نوعمر لڑکا بھی شامل تھا جو کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مطلق پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ ایک ڈاکو اس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ "لڑکے تیرے پاس کیا ہے؟"

"چالیس اشرفیاں" لڑکے نے جواب دیا۔ ڈاکو مذاق سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ دوسرا ڈاکو آیا تو لڑکے نے اسے بھی یہی جواب دیا اسی طرح یکے بعد دیگرے تین ڈاکوؤں نے لڑکے سے یہی جواب پایا۔ ڈاکوؤں کے سردار کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے لڑکے کو بلایا اور پوچھا "لڑکے تیرے پاس کیا ہے؟"

لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا: "چالیس اشرفیاں جو میرے کرتے کی تہہ میں سلی ہوئی ہیں"

کرتے کی تہہ کھولی گئی۔ تو سچ مچ چالیس اشرفیاں نکل آئیں۔

سردار نے حیرت سے کہا: "لڑکے تو نے اتنی بڑی رقم چھپا کیوں نہ لی"۔

"میری ماں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹا ہمیشہ سچ بولنا۔ میں جھوٹ بول کر گنہگار کیوں بنتا" لڑکے نے جواب دیا۔

سردار نے لڑکے کا جواب سنا تو سوچ میں پڑ گیا کہ نوعمر لڑکا ماں کی نصیحت کا اتنا پابند ہے اور میں ایک مدت سے اللہ کے حکم کے خلاف عمل کر رہا ہوں۔ اللہ کے حضور میرا کیا حال ہوگا؟

چنانچہ سردار نے حکم دیا کہ سارا مال قافلے والوں کو واپس کر دو اور خود لڑکے کے پاؤں میں گر کر توبہ کی اور رہزنی کا پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

ساتھیو! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ لڑکا کون تھا؟ یہ تھے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ جو بغداد میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان کے سچ کی برکت سے پیشہ ور ڈاکو توبہ کر کے نیک بن گئے۔ (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

اتفاق و اتحاد

سیماب رشید پراچہ، راولپنڈی

ساتھیو! آپ نے بزرگوں سے تو سنا ہی ہوگا کہ اتفاق میں

برکت ہے اور یقیناً اس پر یقین بھی رکھتے ہوں گے۔ اتفاق کے معنی دراصل مل جل کر کام کرنے کے ہیں آنحضور ﷺ نے فرمایا: "مسلمان قوم کی مثال اس عمارت کی سی ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد ہونا چاہیے۔ اگر مسلمان متحد نہیں ہوں گے تو انجام تباہ کن اور خطرناک ہو گا۔ آج کل ہی دیکھ لیجئے مسلمانوں کو کس قدر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ہر طرف مسلمان ہی کچلے جا رہے ہیں۔ ظلم ہو رہا ہے تو مسلمانوں پر! اس کی وجہ کیا ہے آخر؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب متحد نہیں اگر ہم سب ایک دفعہ متحد ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ کوئی ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ میرے ساتھیو! اگر ہم سب مل جل کر کام کریں' دل لگا کر اور دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کریں تو ہم سب نہ صرف کامیاب ہوں گے بلکہ فتح و نصرت ہمارے قدم چومے گی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی مزدور تنہا کوئی عمارت نہیں تعمیر کر سکتا ایک عمارت کو تعمیر کرنے میں ہزاروں مزدوروں کی محنت شامل ہوتی ہے جب یہ مزدور خون پسینہ ایک کر کے اپنا کام کرتے ہیں تو پھر ایک شاندار اور حسین عمارت بنتی ہے۔ اس لیے میرے ساتھیو! محنت کرو سب مل کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر منزل کی طرف بڑھو۔ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

سچی دوستی

محمد رضوان غنی' منڈی بہاؤالدین

قاسم' طاہر اور وقاص بہت گہرے دوست تھے اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ ایک دن قاسم کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی اس نے سوچا کیوں نہ طاہر سے مدد لی جائے۔ اس نے اپنے خادم کو طاہر کی طرف بھیجا۔ طاہر کو قاسم کا پیغام ملا تو اس نے فوراً پانچ ہزار روپے کا چیک قاسم کی طرف بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ "اگر تمہاری ضرورت ان سے پوری ہو جائے تو مجھے بہت خوشی ہو گی"۔ قاسم کو یہ چیک ملا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اتنے میں وقاص کی طرف سے پیغام آیا کہ اسے کچھ پیسوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔ قاسم نے وہ چیک فوراً وقاص کی طرف پہنچا دیا۔

تھوڑی دیر بعد قاسم کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر طاہر کھڑا تھا۔ قاسم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ میں وہی چیک تھا جو اس نے وقاص کی طرف پہنچایا تھا۔ قاسم نے طاہر سے پوچھا کہ "بھئی یہ کیا معاملہ ہے"۔

طاہر نے کہا کہ "دوست بات یہ ہے کہ میں نے یہ چیک اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے وقاص سے منگوایا تھا۔ ادھر وقاص کے پاس اس چیک کے علاوہ کچھ نہ رہا اور اس نے تم سے کچھ روپے مانگ بھیجے۔ تم نے یہی چیک اسے بھیج دیا وہ حیران ہو کر میرے پاس آیا کہ یہ چیک میں نے تمہیں بھیجا تھا۔ قاسم کے پاس کیسے پہنچ گیا؟ میں نے اسے سارا واقعہ بتایا تو اس نے کہا کہ میں یہ چیک تمہیں دے آؤں تاکہ کسی کی ضرورت تو پوری ہو؟"

قاسم نے کہا "چونکہ ہم تینوں کو پیسوں کی ضرورت ہے اس لیے ہم اس چیک کو کیش کروا کر آپس میں بانٹ لیتے ہیں اس طرح تینوں کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

آج کا کام آج ہی!

عزیز علوی' لاہور

ایک دفعہ کسی گاؤں کا چوہدری سودا لینے شہر میں آیا تو دیکھا کسی جگہ لوگ ایک وکیل کی بڑی تعریف کر رہے ہیں کہ وہ تو سو سو روپے کی ایک ایک بات بتاتا اور ہزار ہزار روپے کا ایک ایک نکتہ سمجھاتا ہے۔

چوہدری نے دل میں کہا۔ "ہم بھی چل کر اس کی کوئی بات سن آئیں تو بہت اچھا ہو"۔ یہ سوچ کر وہ وکیل کے مکان پر پہنچا اور کہنے لگا: "وکیل صاحب! میں نے آپ کی باتوں کی بہت تعریف سنی ہے۔ کوئی بات مجھے بھی سنا دیجئے"۔ وکیل نے کہا۔ "ہم تو ہر بات کی فیس لیا کرتے ہیں"۔ یہ سن کر چوہدری کا شوق اور بھی بڑھا اور اس نے پندرہ روپے نکال کر وکیل صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ روپے لے کر وکیل صاحب نے ایک کاغذ کے پرزے پر یہ مصرع لکھ دیا۔ "آج کا کام نہ رکھو کل پر"۔

چوہدری واپس آیا تو مزدوروں نے کھیت کاٹ کر بہت سا غلہ نکال رکھا تھا۔ شام کو وہ چوہدری سے مزدوری لینے آئے تو اس نے کہا۔ "اس اناج کو گھر میں پہنچاؤ گے تو مزدوری ملے گی"۔

مزدوروں نے کہا۔ "اب تو وقت گزر چکا ہے کل دن نکلتے ہی

رکھوا لینا' دوسروں کے اناج بھی تو سب باہر ہی پڑے ہیں"۔

چوہدری بولا۔ "بھائیو! میں نے تو آج ہی یہ بات سیکھی ہے۔ پس میں تو اسی وقت رکھواؤں گا"۔

آخر مزدوروں کو اناج گھر میں رکھنا پڑا۔ اتفاق سے اسی رات اس زور کی بارش ہوئی کہ سارے گاؤں والوں کا غلہ پانی میں بہہ گیا اور خراب ہو گیا مگر چوہدری کا غلہ بالکل بچا رہا اور بیچتے وقت اسے اتنا نفع ہوا کہ ایک کے بدلے بیسیوں وصول ہو گئے۔

(پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

اڈیٹر کی ٹوکری

عبیدالرحمان ضیا' کسوال

میں ایک خوبصورت کاپی کا کاغذ تھا۔ ایک دن منے میاں کو پتا نہیں کیا سوجھی' مجھے بے دردی سے پھاڑا اور اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ میں بے بسی کی تصویر بنا چپ چاپ لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ منے میاں کے ہاتھ "تعلیم و تربیت" کا سالنامہ لگ گیا ہے اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لیے مجھ پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ خیر مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ چلو اسی بہانے تعلیم و تربیت کے اڈیٹر صاحب کی زیارت نصیب ہو جائے گی۔ میں نے بھی اپنا سینہ پھیلا دیا۔ منے میاں بڑے جوش سے سالنامے کی تعریف بھری روداد لکھنے میں مگن تھے۔ کچھ دیر بعد میں لفافے میں بند لیٹر بکس میں پڑا تھا۔ بالآخر ڈاکیا آیا اور اس نے دوسرے خطوط کے ساتھ مجھے بھی ایک بیگ میں ڈال کر نامعلوم مقام پر پہنچا دیا۔ تقریباً تین دنوں کے بعد ڈاکیا مجھے تھامے تعلیم و تربیت کے دفتر کے سامنے تھا۔ میرے ساتھ ہزاروں اور بھی خطوط تھے۔ یہ سب اڈیٹر کی میز پر پھیلا دیئے گئے۔ ہر خط کو باری باری کھولا گیا۔ اپنی باری پر میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اڈیٹر صاحب نے ناک پر رکھی عینک میں سے مجھے گھورا اور سرسری سی نظر میں پڑھ کر مجھے اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ میری چھٹی حس پھڑک اٹھی شاید خطرے کا الارم بج رہا تھا اور پھر..... وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اڈیٹر صاحب کی بھوکی اور خونخوار ٹوکری نے مجھے ہڑپ کر لیا۔ میں بہت چیخا لیکن طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سنے۔ اس میں اڈیٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ اگر ان کے پاس ظالم ٹوکری ہی نہ ہوتی تو مجھے مجبوراً رسالے میں شائع کرنا ہی پڑتا۔

(چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

جنگِ ستمبر کے چند ایمان افروز واقعات

جنگ ستمبر کے دوران بے شمار ایسے واقعات رونما ہوئے جو آج بھی ہمارے ایمان کو تازگی بخشتے ہیں اور ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ "ہم زندہ قوم ہیں..... پائندہ قوم ہیں"۔ چند واقعات پیش کیے جا رہے ہیں:

☆ ریڈ کراس بلڈ بنک میں ایک رضا کار نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: "ڈاکٹر صاحب! آپ پندرہ دن سے شب و روز مسلسل کام کر رہے ہیں اب تھوڑا سا آرام ہی کر لیں"۔ ڈاکٹر نے نہایت اطمینان سے رضاکار کو تھپکی دیتے ہوئے کہا: "اٹھارہ برس میں بہت آرام کیا ہے بھائی! اب آرام کی مہلت کہاں' یہ قوم کے لیے مسلسل جدوجہد اور سب کچھ قربان کرنے کا وقت ہے آج کا آرام قوم سے غداری ہے"۔

☆ جنگ کے دوران فیصل آباد کے ایک گاؤں نارا ڈاڈا کے ایک نوجوان مجاہد نے میدان جنگ سے اپنی والدہ کو جو بڑھاپے کی زندگی گزار رہی تھیں' یہ پیغام بھجوایا کہ: "اماں جی! میں خیریت سے ہوں اور میدانِ جنگ سے اسی صورت میں گھر واپس آؤں گا جب میرے وطن کو فتح نصیب ہو گی ورنہ لڑتے لڑتے جان دے دوں گا"۔ بوڑھی ماں نے جب یہ پیغام سنا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے اور منہ سے بے اختیار نکلا: "میرے شیر دل بیٹے! تم نے میرا دودھ حلال کر دیا"۔

☆ لاہور میں چند طالب علم' فوجیوں کے لیے ضرورت کی اشیاء اکٹھی کر رہے تھے انہوں نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی اور کچھ دینے کی اپیل کی۔ اندر سے ایک خاتون باہر آئیں ان کے ہاتھ میں ایک پرانی قمیض تھی۔ اسے دیکھ کر طالب علم نے پوچھا: "کچھ اور نہیں دیجئے گا آپ؟ خاتون نے آہستگی سے گردن جھکائی اور کہا: "شوہر اور تین بیٹے وطن کی حفاظت کے لیے دے چکی ہوں' اب میرے پاس اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔

(شیخ ظہیر احمد' اسلام آباد)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے یوم وفات کے حوالے سے ان کے خصوصی معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کی زبانی ان کے آخری دنوں کی یہ مختصر روداد آپ سب کے لیے یقیناً معلومات افزاء ثابت ہو گی!

تین ستمبر کی شام کو جب ہم قائداعظم کے پاس پہنچے تو وہ معمول سے زیادہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ صبح کے وقت چند گھنٹوں کے لیے انہیں سردی لگی تھی لیکن بعد میں سردی کا احساس جاتا رہا۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے آپ کا ٹمپریچر لیا اور مجھے بڑی پر معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے تھرما میٹر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا تو 99 ٹمپریچر تھا۔ پانچ ہفتوں کی تسلی بخش صحت کے بعد حرارت کا یوں یکایک بڑھ جانا بہت تشویشناک تھا۔ چنانچہ بڑی احتیاط سے ان کا معائنہ کیا۔ مختلف طریقوں سے دیکھا بھالا لیکن پھر بھی بخار کا سبب دریافت نہ کر سکے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ حرارت زکام یا کسی اور معمولی شکایت کا باعث ہو ہم نے بخار کا معمولی مکسچر تجویز کیا اور خوراک میں موجودہ حالات کے مطابق رد و بدل کر دیا۔

اگلے روز 4 ستمبر کو ٹمپریچر دن بھر نارمل رہا لیکن 8 بجے بڑھ کر 99 درجے ہو گیا۔ اب میں نے ضروری سمجھا کہ رات کی نرس رکھنے پر زور دوں۔ قائداعظم نے مسکرا کر کہا: کیا یہ مشورہ مس جناح کے اشارے سے دیا جا رہا ہے؟ میں نے کہا: تجویز تو محترمہ فاطمہ جناح ہی کی ہے لیکن خود میں بھی آپ کے لیے نرس ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ بڑے صبر سے میری بات سنتے رہے اور جب میں نے بات ختم کر لی تو فرمایا: نرس کے بارے میں مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ میری حالت اتنی خراب نہیں ہے' آپ یوں ہی فکر کر رہے ہیں۔ میں نے یہ کہہ کر اعتراض رفع کرنا چاہا کہ نرس رات کو آپ کی خوابگاہ میں نہیں رہا کرے گی بلکہ ساتھ والے ڈریسنگ روم میں موجود رہے گی تاکہ بشرط ضرورت بلائی جا سکے۔ لیکن وہ برابر یہ کہہ کر انکار کرتے رہے کہ: "اگر ایسی ہی ضرورت ہوئی تو بڑی آسانی سے گھنٹی بجا سکتا ہوں۔ ایک ملازم رات بھر کمرے کے باہر ہی جاگتا رہتا ہے وہ آجایا کرے گا"۔ یہ سن کر میں چپ رہا۔ مجھے ایک نہایت عمدہ ترکیب سوجھی۔ اگلی صبح میں نے سول سرجن سے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی اچھی نرس ہے جو رات کی ڈیوٹی ادا کر سکے۔ اتفاق سے ایک نرس جو نہ صرف محنتی تھی بلکہ ہوشیار بھی تھی' ریلوے ہسپتال میں موجود تھی۔ ہم نے اسے تیار رہنے کو کہا تاکہ جب ریذیڈنسی میں اس کی ضرورت محسوس ہو تو بلا توقف پہنچ جائے۔ جب میں قائداعظم سے ملا تو انہیں بتا دیا کہ ایک نرس کا انتظام کر لیا گیا ہے اور وہ جلد ہی خدمت کے لیے حاضر ہو جائے گی۔ میں

قائداعظم کو غور سے دیکھتا رہا کہ ان پر اس بات کا کیا اثر ہوتا ہے لیکن انہوں نے بس اتنا ہی کہا: "اچھی بات ہے۔ اگر وہ اتنی ہی اچھی ہے جیسی دن کی نرس تو مجھے عذر نہیں"۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور یہ دیکھ کر کہ دن والی نرس بھی سن رہی ہے' کہا "میرا خیال ہے کہ وہ اگر اس سے بہتر نہ ہوئی کم از کم اس جیسی ضروری ہو گی" میں نے بڑے فاتحانہ انداز سے مس جناح کو اپنی کامیابی کا حال سنایا اور فوراً جا کر نرس لے آیا۔

5 ستمبر کی صبح قائداعظم کا ٹمپریچر پھر نارمل تھا۔ ڈاکٹر شاہ اور میرے طبی معائنہ سے یہ پتا نہ چل سکا کہ شام کو حرارت کیوں ہو جاتی ہے سوائے اس کے کہ بلغم میں کسی قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ رات کو انہیں زیادہ کھانسی نہیں آئی تھی۔ ہم نے ایک بار پھر ان کی بلغم اور خون وغیرہ کی تفتیش کرنی چاہی۔ ان کی ایکس رے تصویر صرف بسترِ علالت پر لی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ڈاکٹر عالم کو بلانے کا پھر انتظام کیا جو اپنے آلات سمیت لاہور جا چکے تھے۔ شام کے وقت انہوں نے ہمیں اپنے نتائج سے آگاہ کیا جن سے پتا چلا کہ بلغم میں نمونیہ کے جراثیم اور خون میں سخت متعدی جراثیم موجود ہیں۔ خواہ مقوی دوائیں کیوں نہ دی جائیں' نمونیہ کے متعدی جراثیم کا ایک ایسے وقت پر ظاہر ہونا جب کہ مریض ہماری توقع کے خلاف اچھا ہو رہا ہو بہت بڑے صدمہ کی بات تھی۔ زیارت میں ہمارے کہنے سے قائداعظم ہفتے تک دن میں دو بار ٹیکہ لگواتے رہے لیکن ہمیں ڈر تھا کہ کہیں قائداعظم تین تین گھنٹے کے وقفے پر نئی دوا کے ٹیکے لگوانے سے انکار نہ کر دیں۔ ایک اور موثر دوا انہیں راس نہ آنے کی وجہ سے نہیں دی جا سکتی تھی اس کے علاوہ گردوں کی کمزوری کے باعث دوا کی پوری خوراک بھی نہیں دے سکتے تھے۔

مس جناح کو یہ سب کچھ بتا کر ہم قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی عام حالت بدستور ویسی تھی لیکن آنکھوں میں چمک تھی اور چہرہ دمکا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر جو شبہ دل میں پیدا ہوا تھرمامیٹر کے ذریعے اس کی تصدیق ہو گئی۔ ان کا ٹمپریچر 100 درجے سے کچھ ہی کم نکلا۔ نبض بھی ٹمپریچر کے لحاظ سے زیادہ تیز چل رہی تھی اور کبھی کبھی ڈوب جاتی تھی۔ اپنی تحقیقات کے نتائج سے آگاہ کر کے ہم نے کہا کہ نمونیہ کے جراثیم کے باعث آپ کو پھیپھڑوں کی متعدی بیماری ہے۔ قائداعظم ہماری تشخیص سے چنداں فکر مند نہ ہوئے اور انہوں نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے"۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم نئی دوا کے ٹیکے لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے پہلے تو یہ کہہ کر روکنا چاہا کہ ایک دن اور انتظار کر کے دیکھ لیا جائے کہ ٹمپریچر کتنا رہتا ہے لیکن ہمارے اصرار پر آخر ٹیکہ لگوانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ رات کے ساڑھے دس بجے ڈاکٹر شاہ نے انہیں پہلا ٹیکہ لگایا۔ ٹیکے سے قائداعظم کو کافی تکلیف ہوئی لیکن کوئی منٹ بھر میں جاتی رہی۔ ہم سے ان کی معمولی تکلیف بھی دیکھی نہیں جا سکتی تھی مگر ٹیکے لگائے بغیر چارہ نہ تھا۔

چھ تاریخ کی صبح کو ان کا ٹمپریچر نارمل ہو گیا لیکن شام تک پھر بڑھ گیا۔ قائداعظم نے اس پر بھی کوئی شکایت نہ کی۔

سات تاریخ کو جب بلغم کا معائنہ کیا گیا تو اس میں نمونیہ کے جراثیم نہیں نکلے اور ہم دعا مانگتے رہے کہ شام تک ٹمپریچر نہ بڑھنے پائے لیکن بارہ بجے کے قریب ایک اور پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ انہیں تھوڑا پیشاب بار بار آنے لگا۔ جسم میں کپکپی سی محسوس ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ٹمپریچر بھی بڑھ گیا۔ سانس کی تکلیف نے انہیں اتنا پریشان کیا کہ ساری کھڑکیاں کھلوا دیں اور میز کا پنکھا منگوا لیا۔

میری قیام گاہ پر اے ڈی سی نے مجھے ٹیلی فون کیا اور میں ڈاکٹر شاہ کو ساتھ لے کر ریذیڈنسی پہنچا۔ ہم نے قائداعظم کا معائنہ کیا اور پھر آکسیجن دینی شروع کی۔ آکسیجن سے تنفس کو فائدہ ہوا اور بے چینی میں کافی کمی ہوئی۔

قائداعظم کی حالت اب ہمارے نزدیک تشویش ناک ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہماری رائے ہوئی کہ بعض دوسرے (خصوصاً غیر ممالک کے) ڈاکٹروں سے مشورہ کیا جائے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے ہم سے اتفاق کیا۔ میں نے مشورے کی غرض سے لندن کے دو مشہور ڈاکٹروں کا نام تجویز کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کا خیال تھا کہ شاید قائداعظم انہیں بلانا پسند نہ کریں۔ لہٰذا انہوں نے تجویز کیا کہ کسی امریکن یا جرمن ڈاکٹر کو بلایا جائے۔

آٹھ ستمبر کو میں نے محترمہ فاطمہ جناح کو کہا کہ امریکن

ماہرین کے پہنچنے میں ممکن ہے کچھ دیر لگ جائے اس لیے ایک اور ڈاکٹر کو مشورے میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ کچھ دیر بحث کے بعد ہم نے کراچی سے ڈاکٹر ایم اے مستری کو بلوانے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں یقین نہ تھا کہ قائداعظم ایک نئے معالج پر رضا مند ہوں گے لیکن پھر بھی ہمت کر کے ان کی اجازت کے بغیر ڈاکٹر مستری کو بلا لیا گیا۔ اس دن ٹمپریچر اور بڑھ گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے مجھے رات کے کھانے پر رکنے کے لیے کہا لیکن میں ان سے اجازت لے کر گھر چلا گیا۔ میں ضرورت کے وقت موجود رہنے کے خیال سے کھانا کھا کر فوراً ریزیڈنسی واپس لوٹ آیا اور ساڑھے گیارہ بجے تک محترمہ فاطمہ جناح سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر چلی گئیں اور میں نچلی منزل میں ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میرا سونے کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا لیکن اس خیال سے کہ نرس کو اچانک میری ضرورت نہ پڑے میں جاگتا رہا اور کچھ رسالے نکال کر پڑھنے لگا تاہم سونے سے پہلے ایک بار قائداعظم کی حالت دیکھنے کے لیے گیا۔ نرس سے معلوم ہوا کہ وہ بے چین ہیں اور محترمہ فاطمہ جناح بے چینی بڑھنے پر اپنے ہاتھ سے ان کو آکسیجن پہنچاتی ہیں۔ آکسیجن لینے کے بعد انہیں ایک آدھ گھنٹے کے لیے غنودگی آجاتی ہے۔

دوسرے دن یعنی 9 ستمبر کو صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھا اور قائداعظم کی صحت کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد تیز چائے کی پیالی پی جس سے طبیعت کچھ چونچال ہوئی۔ ناشتے کے بعد میں نے جا کر قائداعظم کی حالت معلوم کی۔ ٹمپریچر نارمل تھا لیکن عام حالت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ صرف کمزوری تھی جو بخار اور کم خوراک کی وجہ سے ہو گئی تھی۔ نرس سے معلوم ہوا کہ محترمہ فاطمہ جناح تقریباً ساری رات جاگتی اور اپنے بھائی کے کمرے میں بار بار جھانکتی رہیں اور جب دیکھتی تھیں کہ بے چینی بڑھ گئی ہے تو خود آکر آکسیجن پہنچاتی تھیں۔ میں ان کے اس محبت اور خدمت کے پاکیزہ جذبے سے بہت متاثر ہوا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ دبلا پتلا ہونے کے باوجود کس طرح وہ مسلسل دن رات تیمار داری کے سخت فرائض انجام دے رہی تھیں۔

ڈاکٹر مستری 9 ستمبر کی صبح کو یہاں پہنچے۔ 1931ء کے بعد یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سال گائز ہسپتال لندن میں ہم دونوں نے ایک ساتھ ایم۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ جے جے ہسپتال بمبئی میں فزیشن تھے اور کچھ دن سے ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بیماری کا مکمل حال سنایا اور یہ بھی بتایا کہ اب تک ہم کیا کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد میں انہیں قائداعظم کی خدمت میں لے گیا۔ مریض کو دیکھنے کے بعد انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جو کچھ مناسب اور ممکن تھا وہ ہوتا رہا ہے اور کسی مزید کارروائی کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے نزدیک امریکن ڈاکٹر بھی اس کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکیں گے۔ ہم نے محترمہ فاطمہ جناح کو اپنی متفقہ رائے بتا دی۔ شام کے وقت قائداعظم کا ٹمپریچر نارمل سے ذرا زیادہ رہا لیکن عام حالت میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تاہم قائداعظم نے ریڈیو پر خبریں سننے کی خواہش ظاہر کی۔

دو چار دن سے قائداعظم کشمیر کے خیال میں غلطاں و پیچاں تھے۔ ایک بار تیز حرارت اور بے چینی کے عالم میں مس جناح نے آپ کو اسی مسئلہ کے متعلق بڑبڑاتے سنا۔ ایک اور موقع پر ایسی ہی حالت میں وہ یہ کہتے سنے گئے کہ "کشمیر کمیشن کو آج مجھ سے ملنا تھا وہ اب تک کیوں نہیں آئے؟ کہاں چلے گئے؟" کشمیر سے ان کی اس درجہ قلبی وابستگی نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ آخری دم تک کشمیر کی گتھی بدستور ان کے افکار و احساسات پر حاوی رہی اور وہ اسی ادھیڑ بن میں رہے۔

قائداعظم کے بارے میں ہماری تشویش خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ آخر کار اس صورتِ حال کے پیش نظر یہی فیصلہ کیا گیا کہ انہیں کراچی واپس لے جایا جائے۔ چنانچہ ضروری انتظامات مکمل ہو جانے کے بعد ہم بذریعہ طیارہ کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔ چار بج کر پندرہ منٹ پر ہم ماری پور کے ہوائی اڈے پر اترے۔ میں جوں ہی جہاز میں سے نکلا تو گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کو ایمبولینس کار لیے کھڑا پایا۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی بھی نرس نہ تھی۔ کراچی میں گرمی تھی مگر تیز ہوا چل رہی تھی اس لیے شدت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جہاز کے اندر چونکہ حبس تھا ہم نے فوراً قائداعظم کو لے جا کر ایمبولنس میں لٹا دیا۔ مس جناح اور نرس جو

کوئٹہ سے ساتھ آئی تھی ایمبولنس میں بیٹھ گئیں۔ گورنر جنرل کی قیام گاہ نو دس میل دور تھی۔ ہم نے یہ فاصلہ نہایت سست رفتاری سے طے کیا۔

ہم نے ابھی بمشکل چار میل طے کیے ہوں گے کہ ایمبولنس رک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ڈرائیور نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ اسے جلد درست کر لے گا لیکن کوئی بیس منٹ تک وہ مصروف رہا لیکن گاڑی پھر بھی نہ چل سکی۔ مس جناح نے ملٹری سیکرٹری کو نئی گاڑی لانے کے لیے روانہ کیا۔ ڈاکٹر مستری ان کے ہمراہ گئے۔

ایمبولنس میں حبس تھا۔ نرس اور ملازم پنکھا ہلا رہے تھے لیکن قائداعظم کو پھر بھی پسینہ آرہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ انہیں کسی اور کار میں لے جائیں لیکن اس میں سٹریچر نہیں رکھا جا سکتا تھا اور وہ کمزور اتنے تھے کہ پچھلی سیٹ پر ٹیک نہیں لگا سکتے تھے۔ پسینے سے ان کے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ باہر ہوا بھی تیز چل رہی تھی اور انہیں ہوا لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ جوں ہی میں نے ان کا معائنہ کیا تو سخت خوف زدہ ہوا۔ ان کی نبض نحیف اور بے قاعدہ ہوتی جا رہی تھی۔ میں ٹرک کی طرف دوڑا اور تھرمس لے آیا۔ اس میں گرم چائے تھی۔ مس جناح نے انہیں فوراً پیالہ بھر چائے پلائی۔ انہوں نے بتلایا کہ دن بھر میں پہلی مرتبہ انہوں نے اب غذا لی' وہ اب تک انکار کرتے آئے تھے اور صرف پھلوں کا رس دو ایک بار چکھا تھا۔ ایمبولنس کی خرابی تکلیف دہ تھی ورنہ اس کے علاوہ تمام باتیں مریض کے حق میں تھیں اور اس صورت میں جب کہ وہ ہوائی جہاز کا سفر بھی طے کر چکے تھے۔ یہ کتنا بڑا المناک حادثہ ہوتا اگر وہ برلب سڑک ہی جاں بحق ہو جاتے۔ نہایت بے چینی سے میں نے پھر ان کی نبض کو محسوس کیا۔ چائے کے ایک پیالے نے انہیں بحال کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے نبض باقاعدہ ہو گئی تھی۔ میں شہر کی طرف نظر جمائے تھا لیکن ایمبولنس آنے کی کوئی علامت نہ تھی بہت سے ٹرک اور موٹریں ہمارے پاس سے گزر رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ہمارے کام کا نہ تھا۔ آخرکار اس اذیت بخش طویل وقفہ کے بعد ایمبولنس آن پہنچی اور ہم نے فوراً قائداعظم کو اس میں بٹھایا اور آگے بڑھے۔ اس ایمبولنس پر گورنر جنرل کا جھنڈا نہیں لہرا رہا تھا اس لیے کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ قائداعظم اس خطرناک حالت میں کراچی کی سڑکوں پر سے گزر رہے تھے۔

چھ بج کر دس منٹ پر ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچے یعنی ماری پور ہوائی اڈے پر اترنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد۔ ہمارے اطمینان قلبی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو سفر کے بخیریت طے پا جانے پر ہمیں نصیب ہوا جو شاید ایک المناک حادثہ کی شکل اختیار کر لیتا۔

ایمبولنس قائداعظم کے کمرے کے دروازے کے عین سامنے رک گئی اور انہیں سٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ نرس نے ان کی حرارت دیکھی اور نبض کو محسوس کیا۔ حرارت معمولی تھی اور نبض بالکل باقاعدہ۔ جب قائداعظم کی طرف سے مجھے کچھ اطمینان ہوا تو میں ملٹری سیکرٹری کے کمرے میں گیا۔ ہاتھ منہ دھویا اور غٹاغٹ چائے کے چار پیالے چڑھا گیا۔ چند منٹ کے بعد ڈاکٹر مستری قائداعظم کے کمرے میں گئے تو وہ سو رہے تھے۔

میں پیلس ہوٹل پہنچا جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ جلدی سے کھانا کھایا اور پھر گورنر جنرل کے ہاں ٹیلی فون کیا تاکہ کار آجائے اور میں وہاں پہنچ جاؤں۔ مجھے ان کے اے ڈی سی کا پیغام دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ قائداعظم کی نبض بے قاعدہ ہو گئی ہے اور مجھے فوراً وہاں پہنچنا ہے۔

میں نو بج کر پندرہ منٹ پر قائداعظم کے پاس تھا۔ جب میں نے ان کا معائنہ کیا تو ان کی نبض نحیف تھی اور کچھ بے قاعدہ بھی۔ انہیں پسینہ بھی آرہا تھا۔ اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے میں نے فوراً انہیں مقوی قلب ٹیکہ لگانا چاہا اور منہ سے خون کا دورہ تیز کرنے کی دوا پلانے کو کہا۔ لیکن وہ دوا نہ پی سکے اور وہ منہ کے گوشے میں سے باہر بہہ گئی۔ میں نے کچھ اینٹیں اور لکڑی کے ٹکڑے طلب کیے کہ ان کے پلنگ کا پچھلا حصہ اونچا کیا جا سکے۔ میں نے ان کی ٹانگوں پر پٹیاں بھی لپیٹنی چاہیں تاکہ خون تیز دورہ کرتے ہوئے خاص جگہوں پر جا پہنچے لیکن ان چیزوں کو اس گھر میں ملنا مشکل تھا۔ میں نے پلنگ کا پچھلا حصہ خود ہی اٹھا رکھنا چاہا۔ پلنگ بہت بوجھل تھا میں نے اسے چھ انچ کے قریب اٹھا تو لیا لیکن اسے زیادہ دیر اٹھائے نہ رکھ سکتا تھا۔ مس جناح نے میرا ہاتھ بٹانا چاہا لیکن میں نے انہیں منع کر دیا اور کچھ کتابیں لانے کو کہا جو

اینٹوں کی جگہ استعمال کی جائیں۔ پھر بھی نبض بہتر نہ ہوئی۔ جب میں اس طرح مصروف کار تھا تو ڈاکٹر مستری اور ڈاکٹر شاہ آئے۔ میں نے ڈاکٹر شاہ کو نس میں ٹیکہ لگانے کو کہا۔ وہ ایسے ٹیکے لگانے میں ماہر تھے لیکن یہاں ناکام رہے اس لیے کہ نسیں بالکل کام نہیں کر رہی تھیں۔ نرس انہیں متواتر آکسیجن دیئے جا رہی تھی۔ مقوی قلب دوا پھر منہ سے پلانے کی کوشش کی گئی لیکن قائداعظم اسے پی نہ سکے۔ ہم بے بس سے ہو کر رہ گئے۔

بقول ڈاکٹر ریاض علی شاہ: قائداعظم پر اس وقت بے ہوشی طاری تھی۔ نبض کی رفتار بھی غیر مسلسل تھی۔ قدرے حالت سنبھلی چند منٹ تک حالت اچھی رہی پھر دل ڈوبنے لگا نبض پھر غیر مسلسل ہو گئی۔ سانس رک رک کر آنے لگی اور بے ہوشی کے عالم میں آپ نے کچھ کہا۔.....

"اللہ..... پاکستان"

آپ کے مصنوعی دانت پہلے ہی نکال دیئے گئے تھے اس لیے ان دو لفظوں کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ آپ نے کیا کہا ہے۔ یہ بڑا رقت انگیز منظر تھا۔ ایک طرف میں، کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر مستری کھڑے تھے اور دوسری طرف محترمہ فاطمہ جناح بچشم نم کھڑی تھیں۔ وہ اس درد انگیز منظر کی تاب نہ لا سکیں اور کمرے کے ایک طرف صوفے پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ میں نے نرس سے کہا کہ وہ جا کر محترمہ فاطمہ جناح کو تسلی دے۔ میں خود قائداعظم کے بستر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس وقت دیر دیر سے سانس آنے لگی تھی اور نبض ڈوب چکی تھی۔ میں نے دیر تک ان کی آنکھیں بند رکھیں۔ جب آخری سانس کے بعد پھر سانس نہ آئی تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس وقت گھڑی میں دس بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ آج وہ بطلِ جلیل، میدانِ سیاست کا شہسوار جس نے اپنے عزم، استقلال، فراست، سیاست اور ذہانت سے بڑے بڑے سیاست دانوں کو شکست دی۔ جس نے ایک تخیل کو حقیقت بنا دیا۔ جس نے ملتِ اسلامیہ کے منتشر اجزا کو ایک مرکز پر لا کر زندہ قوم بنا دیا۔ جس کے تدبر سے بڑے سے بڑے وائسرائے کانپ اٹھے، حکومت متزلزل رہی، آج ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ موت کے بے مہر ہاتھوں نے اس چراغ کو گل کر دیا جس سے ملت اسلامیہ کی محفلیں فروزاں تھیں۔

☆☆☆

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ دنیا کا سب سے بڑا پارک "نیشنل پارک" امریکہ میں ہے۔ ☆ دنیا میں سب سے زیادہ سکول شکاگو امریکہ میں ہیں۔ ☆ دنیا میں سب سے زیادہ پیدا ہونے والی سبزی "آلو" ہے۔ ☆ دنیا کی سب سے قدیم اسلامی یونیورسٹی جامعۃ الازہر قاہرہ میں ہے۔ ☆ دنیا کی سب سے قدیم بادشاہت جاپان میں ہے۔ ☆ دنیا میں سب سے زیادہ اخبار روس میں چھپتے ہیں۔ ☆ دنیا کی سب سے پہلی کار کا نام "نیشان" ہے۔ ☆ بلحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا شہر "ٹوکیو" (جاپان) ہے۔ ☆ دنیا کی سب سے قیمتی دھات "پلاٹینم" ہے۔ ☆ دنیا کی سب سے بڑی دوربین کا نام "ہبل" ہے۔ ☆ دنیا کی سب سے پہلی چھپنے والی کتاب جرمنی میں 1457ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ☆ دنیا کی سب سے پہلی لوہے کی توپ انگلستان میں 1589ء میں بنی۔ ☆ دنیا کی سب سے پہلی گھڑی خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بنی۔ دنیا میں سب سے پہلے گندھک کی دیا سلائی انگلستان میں 1838ء میں بنی۔ ☆ دنیا میں سب سے پہلا اخبار "پیکنگ گزٹ" چین سے نکلا۔

(مرسلہ: گوہر نجیب جیلانی، میانوالی)

حیران کُن

سکاٹ برادرز

سید شوکت اعجاز

15 صدی عیسوی کے سکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز سوئم کے دربار میں ایک انوکھا عجوبہ دیکھنے میں آیا۔ وہ یہ کہ دو بھائیوں کا جسم ایک تھا لیکن دو سر اور چار بازو تھے۔ بادشاہ کے حکم سے انہیں موسیقی اور آرٹ کی اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ دربار میں جب وہ کوئی رزمیہ نظم گاتے یا آلہ موسیقی بجاتے تو چاروں بازو ایسے ہلتے جیسے ہیلی کاپٹر کے پر چل رہے ہوں۔ باقی تمام زندگی وہ بادشاہ کے زیر سایہ رہے۔ 28 سال کی عمر میں ایک بھائی کا انتقال ہو گیا تو اگلے پانچ دنوں میں دوسرا زندہ جڑواں بھائی اپنے مردہ بھائی کے سر کے ساتھ آہ وزاری کرتے ہوئے انتقال کر گیا۔

عجیب و غریب پل

سوڈان کے دریا کے 50 گز چوڑے پاٹ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ تھے اور ان کی شاخیں بل کھا کر اس طرح الجھ گئی تھیں کہ انہوں نے باقاعدہ ایک قدرتی پل کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ مقامی لوگ اسے قدرت کا عطیہ جانتے تھے اور کئی میل کے لمبے سفر سے بچنے کے لیے اس محفوظ پل کو استعمال میں لاتے تھے۔

رسہ کود' تھامس مور

آسٹریلوی باشندے تھامس مور کو رسے کی مدد سے اُچکتے رہنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ تیز رفتاری کے لیے بھی وہ یہی طریقہ سفر اختیار کرتا تھا۔ اسی طرح کودتے ہوئے اس نے آسٹریلیا کے شہروں (ایڈیلیڈ اور ملبورن) کے درمیان ایک ہزار میل کا سفر طے کیا۔ 21 نومبر 1937ء کو مورس نے عجیب و غریب ریکارڈ بنایا یعنی بغیر رکے اس نے دو گھنٹے تک 22806 کودیں مکمل کیں یعنی اس طرح اس نے دو گھنٹوں میں 12 میل کا سفر طے کیا۔

آیئے دوست بنائیں

اسامہ اصغر 12 سال
کرکٹ کھیلنا
NIH کالونی مکان نمبر E-14
نزد چک شہزاد، اسلام آباد

کامران عاشق 14 سال
اچھی کتابوں کا مطالعہ
چک قلندر ڈاکخانہ [illegible]
تحصیل و ضلع چکوال

علی حسن 12 سال
کیرم کھیلنا
مکان نمبر 10 گلی نمبر 13
[illegible]، سرگودھا

عثمان منیر احمد 15 سال
مصوری، مطالعہ
[illegible] محلہ، [illegible] آباد
سیالکوٹ شہر

محمد آصف ڈوگر 15 سال
مطالعہ کرنا
[illegible]
ڈاکخانہ [illegible]، ضلع [illegible]

عزیز احمد 17 سال
کرکٹ کھیلنا، [illegible]
[illegible]
[illegible]

حسنین خالد لودھی 14 سال
کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا
مکان نمبر 1088 گلی [illegible]
حویلی لکھا

اکرم شہزاد اعوان 20 سال
کرکٹ کھیلنا
مقام و ڈاکخانہ [illegible]
تحصیل و ضلع چکوال

محمد حبیب اختر 8 سال
کرکٹ کھیلنا
[illegible] تحصیل [illegible]
ضلع کوہاٹ

محمد احمد نواز 12 سال
مطالعہ
مکان نمبر 230/C
[illegible]

عبدالودود 15 سال
مطالعہ
مکان نمبر 14 گلی نمبر 53
[illegible] سانده، لاہور

فرحان طارق 15 سال
فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا
[illegible] گلی نمبر 2
[illegible] آباد

محمد عمران 14 سال
مطالعہ
گلی نمبر 4، مکان نمبر 105
[illegible] کالونی، اوکاڑہ

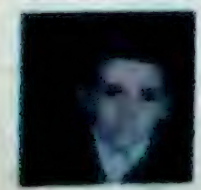

ایوب بخش 15 سال
کرکٹ کھیلنا
لالہ زار کالونی
پشاور

عون محمد 8 سال
کرکٹ کھیلنا، کہانیاں پڑھنا
[illegible]
[illegible]

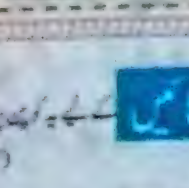

محمد انس ملک 11 سال
کرکٹ کھیلنا
[illegible]
[illegible]

عطاء اللہ 16 سال
کرکٹ کھیلنا
[illegible]
ڈاکخانہ [illegible]، کوہاٹ

یاسر علی 18 سال
سیر و تفریح
[illegible]
[illegible]، اوکاڑہ

حسن شاہ 10 سال
مطالعہ اور کرکٹ کھیلنا
مکان نمبر 359 یونٹ 10
بلاک A لطیف آباد، حیدر آباد

سید جنید بخاری 16 سال
کتابیں پڑھنا، قلمی دوستی
مقام و ڈاکخانہ [illegible]
[illegible]

محمد فرحان سلطان 14 سال
[illegible]
[illegible]
تحصیل و ضلع کرک

سید مسعود خان 11 سال
مصوری
مکان نمبر 1088 گلی [illegible]
حویلی لکھا، اوکاڑہ

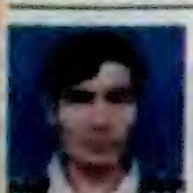

آیئے دوست بنائیں

[illegible] کوپن پر کر کے [illegible] تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
([illegible])

نام .... عمر ....

مشاغل ....

پتا ....

پاک مجاہد

عبید الرحمان ضیاء' کسووال (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

محمد عاطف رضا' بھلوال (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

عدنان احمد' فیصل آباد (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

احمد بلال' راولپنڈی (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

حسنین مختار' سرگودھا (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

عمارہ کنول' حافظ آباد (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:۔ محمد رضوان صدیقی راولپنڈی۔ محمد عمیر رشید خوشاب۔ ایمن احمد اسلام آباد۔ محمد ذیشان خالد بورے والا۔ محمود لاہور۔ احمد حسین راولپنڈی۔ نائلہ مختار کراچی۔ عدنان حفیظ پشاور۔ صوفیہ احمد حیدر آباد۔ تسلیم کوثر ملتان۔ نوازش علی سیالکوٹ۔ فریحہ جعفری چشمہ۔ گلریز کمال ن۔ گوہر جان کوئٹہ۔ سلیمہ حسن حیدر آباد۔ عزیزہ سلطانہ کراچی۔ محمد ابوبکر شفیق لاہور۔ صائمہ یوسف اسلام آباد۔ توقیر علی جھنگ صدر۔ شہباز حسین ساہیوال۔ بکردار ثاقیہ ڈی ایہ۔ نسیم طاہر فیصل آباد۔ محمد اکرم ملتان۔ حسنات سلیم کراچی۔ جاوید حسن کوٹلی۔ مہران جونیجو حیدر آباد۔ فرحت عباد کوہاٹ۔ سلمان بٹ گوجرانوالا۔

آئندہ کا موضوع: پہاڑی منظر — آخری تاریخ 10 ستمبر

اکتوبر کا موضوع: ندی کنارے — آخری تاریخ 10 اکتوبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

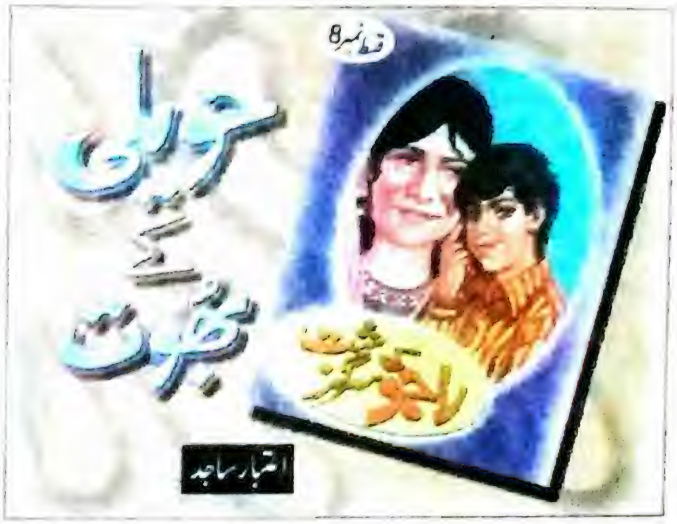

ایک دھچکے سے گاڑی رک گئی۔ اسٹیشن پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ پلیٹ فارم پر سو رہے تھے یا اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے آنے والی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

ٹکٹ چیکر راجو کو لے کر نیچے اترا..... کہنے لگا..... "سچ سچ بتاؤ۔ تم بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے یا تم نے ٹکٹ خریدا تھا۔ دیکھو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ابھی ریلوے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ پولیس کا نام سن کر راجو کی ٹانگیں کانپنے لگیں..... اس نے قسمیں کھا کھا کر بتایا کہ بچھو بھائی نے اسے ٹکٹ کے علاوہ پچاس روپے نقد بھی دیئے تھے جس میں سے اس نے کھانا کھایا تھا اور فقیر کو خیرات دے کر اس کے پاس کچھ روپے بچ بھی گئے تھے جو اس کے سونے کے بعد کسی نے ٹکٹ سمیت نکال لیے۔

ٹکٹ چیکر نے غور سے اس کی بات سن کر ایک لمحہ کے لیے کچھ سوچا' پھر بولا "چاہوں تو میں تمہارے ساتھ بہت کچھ کر سکتا ہوں مگر شکل سے تم عادی مجرم نظر نہیں آتے اس لیے میں تمہیں چھوڑتا ہوں مگر اب تم گاڑی میں سوار نہیں ہو سکتے۔ تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہی نرمی برت سکتا ہوں کہ تمہیں گاڑی سے اتار دوں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام....." یہ کہہ کر وہ گاڑی کی طرف بڑھا مگر پھر واپس آگیا۔ بولا..... "آئندہ کبھی بلا ٹکٹ سفر کرنے کی غلطی نہ کرنا..... میں تو خیر تمہیں چھوڑے جا رہا ہوں مگر ممکن ہے آئندہ تم کسی ایسے افسر کے ہتھے چڑھ جاؤ جو سیدھا تمہیں پولیس کے حوالے کر دے۔ اس لیے میری یہ بات یاد رکھو کہ قانون کا احترام بہت ضروری ہے"۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک ڈبے میں چڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ راجو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی چل پڑی۔

اس کا جی چاہا کہ بھاگ کر کسی ڈبے میں چڑھ جائے مگر اسے ٹکٹ چیکر کی تنبیہہ یاد آگئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سامنے سے آخری ڈبے بھی گزر گئے اور اسٹیشن خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ پلیٹ فارم کی گھڑی خراب تھی البتہ آسمان پر پھیلی ہوئی تاریکی سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔

راجو آسمان کی طرف دیکھتا ہوا پلیٹ فارم کے اس کنارے کی طرف بڑھا جہاں ایک بینچ خالی پڑی تھی۔ اچانک وہ بڑے زور سے کسی سے ٹکرایا اور دھڑام سے پختہ فرش پر گر پڑا۔

ٹکرانے والا بھی اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس کا ڈنڈا بھی گرا اور اس کا کشکول بھی..... راجو چونک کر اٹھ بیٹھا..... ڈبے والا اندھا فقیر اپنا ڈنڈا اور کشکول ٹٹول رہا تھا۔ راجو نے دونوں چیزیں اسے پکڑائیں اور اٹھنے میں مدد دی۔

"اف..... اُف....." اندھا فقیر کراہتے ہوئے بولا..... "مار ڈالا مجھے"۔

"معاف کرنا بابا....." راجو نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا..... "میں نے دیکھا نہیں تھا"۔

اندھے نے اپنے کان کھڑے کیے۔ اپنی اندھی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا..... حیران ہو کر بولا:

"یہ تو کوئی جانی پہچانی آواز ہے تم وہی تو نہیں جس نے مجھے ایک روپیہ خیرات دی تھی ریل کے ڈبے میں"۔

"ہاں..... میں وہی ہوں....." راجو نے آہستہ سے کہا۔

اندھا فقیر بولا..... "سکھر میں رہتے ہو کیا؟"

"نہیں"۔

راجو نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"مجھے ٹکٹ چیک کرنے والے نے گاڑی سے اتار دیا۔ میرا ٹکٹ اور میرے پیسے چوری ہو گئے تھے"۔

"افوہ....." اندھے فقیر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا"۔ کون تھا وہ ظالم' کس نے چرا لیے تمہارے پیسے۔ تم کہاں جا رہے تھے؟ راجو نے اپنے شہر کا نام بتایا۔

"اُف..... اُف" اندھے فقیر نے کراہتے ہوئے کہا۔ اللہ بابا وہ تو بہت دور ہے۔ اب تم کہاں جاؤ گے اس نئے شہر میں تو تمہارا ٹھکانہ ہی کوئی نہیں۔ لوگ تو فقیر مسکین لاوارث کو بھی خیرات نہیں دیتے..... تمہاری مدد کون کرے گا؟"

"کیا بتاؤں بابا....." راجو نے پریشان ہو کر کہا..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا"۔

"ہائے..... ہائے..... ہائے....." اندھا فقیر لاٹھی ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور بولا....." تم نے تو مجھ مسکین فقیر کو گرا کر میرا کچومر ہی نکال دیا' اب مجھے میرے گھر پہنچا دو..... اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ میں وہیں مسجد میں تمہارے کھانے پینے کا انتظام کروا دوں گا۔ اُف اللہ بابا..... میں تو مر گیا"۔ راجو کو بے چارے فقیر پر بڑا ترس آیا' پوچھنے لگا:

"تمہارا گھر کہاں ہے بابا"۔

اندھا فقیر کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "میرا بازو پکڑ کر میرے ساتھ چلو' میں اپنے ڈنڈے سے ٹٹول ٹٹول کر راستہ بتاتا جاؤں گا"۔

راجو نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ ڈنڈے کے سہارے پلیٹ فارم سے نیچے اترا اور ریل کی پٹڑیوں پر ڈنڈے کھٹ کھٹ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ شاید وہ اپنے راستے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ اس اندھیری رات میں بھی وہ بغیر تاروں سے الجھے ہوئے اطمینان سے راجو کے ساتھ چلتا رہا۔

وہ ڈنڈے کو سامنے آنے والی رکاوٹوں سے ٹکرا کر سمت کا اندازہ لگاتا اور پھر قدم آگے بڑھاتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ آواز لگاتا جاتا۔

اللہ بابا..... غریب مسکین لاوارث فقیر ہوں..... یا میرے مولا تیرا ہی آسرا.....

مختلف بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ شہر سے دور ایک ایسے اُجاڑ اور سنسان علاقے میں داخل ہوئے جہاں کھنڈر پھیلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان تاروں کی چھاؤں میں ایک بڑی سی حویلی کا سایہ نظر آرہا تھا۔ راجو اور اندھے فقیر کے وہاں پہنچتے ہی بہت سے کتے مل کر بھونکنے لگے۔ راجو چلتے چلتے رک گیا۔

اندھا فقیر بولا "کیوں رک گئے۔ چلتے رہو بابا" پھر اس نے اپنا ڈنڈا زور زور سے زمین پر مار کر منہ سے ایک خاص آواز نکالی۔ بھونکتے ہوئے کتے اچانک خاموش ہو گئے۔ البتہ ہلکی ہلکی آواز میں غراتے رہے۔

دونوں پھر چلنے لگے۔

راجو نے سوچا تھا' فقیر کسی بستی

میں رہتا ہو گا..... مگر اس اندھے فقیر نے تو اپنے رہنے کے لیے ایسی جگہ تلاش کی تھی جو دور دور تک سنسان اور ویران تھی۔ شہر بھی یہاں سے کافی فاصلے پر تھا اور پختہ سڑک بھی کافی دور تھی۔ یہ پورا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور جھینگر بھی بول رہے تھے۔

راجو کو اس ویرانے میں خوف کا احساس ہونے لگا۔ اس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بابا تم اتنی ڈراؤنی جگہ پر کیوں رہتے ہو..... یہ علاقہ تو بالکل ہی سنسان ہے"۔

اندھا فقیر بولا..... اللہ بابا فقیر مسکین لاوارث لوگ شہر کی رونق سے دور رہتے ہیں۔ شہر تو بڑے آدمیوں کے رہنے کے لیے ہوتا ہے فقیروں کے لیے تو ایسی جگہ ہی ٹھیک ہے۔

راجو نے اپنے دل میں سوچا۔ بابا ٹھیک ہی تو کہتا ہے فقیروں کو شہر میں رہنے کی جگہ کہاں مل سکتی ہے۔ اسی لیے تو یہ بے چارے ایسی ٹوٹی پھوٹی جگہوں پر رہتے ہیں۔

اندھا فقیر چلتے چلتے رک گیا..... بولا..... "اللہ بابا..... اپنا ڈیرہ آگیا' آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

راجو نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا جس حویلی کا سایہ اسے دور سے نظر آیا تھا اب وہ اس کے سامنے تھی اس نے آگے بڑھ کر بڑے غور سے دروازے کی زنجیر ٹٹولی اور پھر ہاتھ میں پکڑ کر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

پہلے تو خاموشی رہی۔ پھر اندر سے بہت سے لوگوں کے کھنکھارنے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر پختہ فرش پر بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک کتے کی غراہٹ گونجی۔ شاید کوئی دروازہ کھولنے آرہا تھا۔

اندھا فقیر راجو سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ بیساکھیوں کی آواز پر اس نے دو بار کہا..... "اللہ بابا..... اللہ بابا....." اور اچانک دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک لنگڑا فقیر تھا جس کی بغلوں میں بیساکھیاں تھیں اور ہاتھ میں مٹی کے تیل کا چراغ..... جس کا ننھا سا شعلہ ہوا کے جھونکے سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"آگے بڑھو بابا....." اندھے فقیر نے وہیں کھڑے کھڑے راجو سے کہا۔ راجو نے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک کتا غرا کر اس کی طرف جھپٹا۔ راجو سہم کر پیچھے ہٹا۔ مگر کتا چھلانگ لگا کر اس پر آپڑا۔ لنگڑے فقیر کے ہاتھ سے چراغ نیچے گر پڑا۔ اس نے زور سے کہا۔

"موتی..... موتی..... دُر..... دُر....."

مگر اتنی دیر میں کتے نے راجو کی دائیں پنڈلی پر دانت گاڑ دیئے۔ راجو کے منہ سے درد کے مارے زور کی چیخ نکلی اور وہ

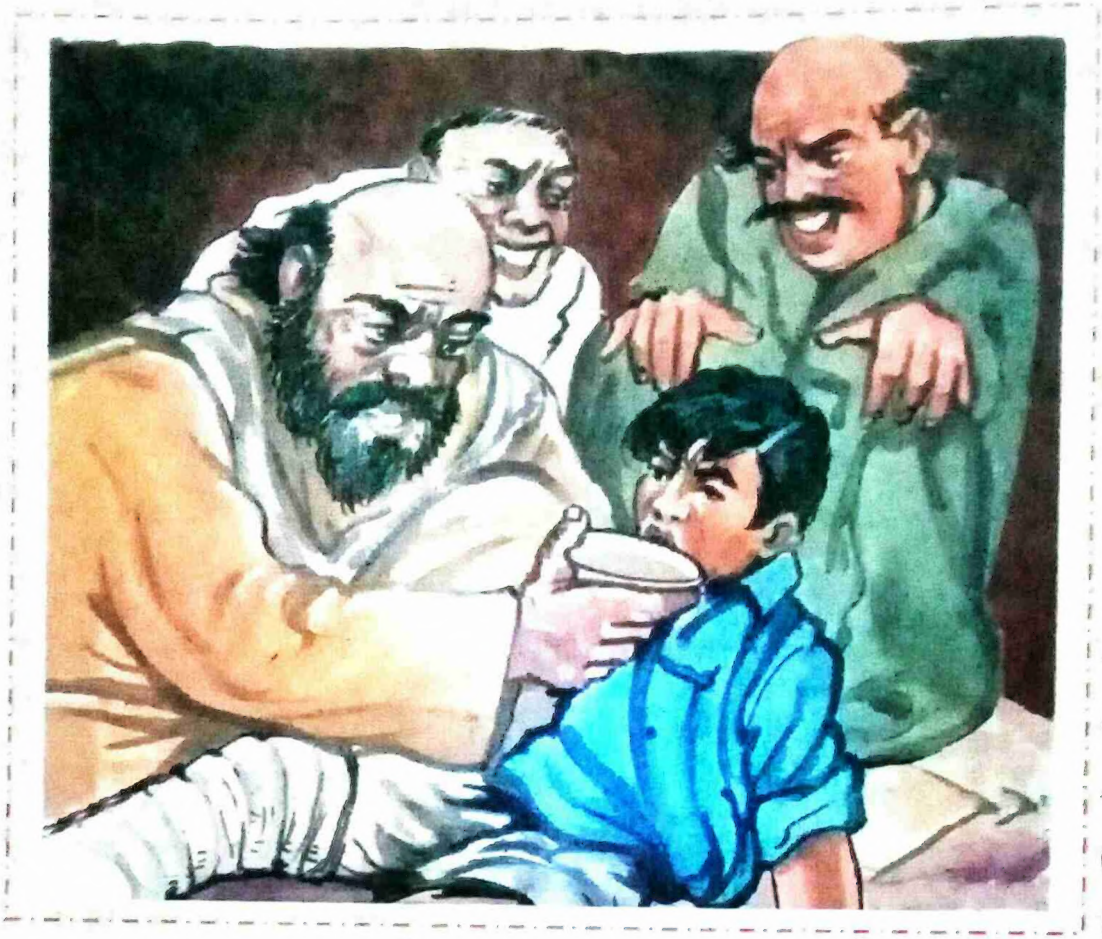

دھڑام سے زمین پر گرا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اسے صرف اتنا سنائی دیا کہ اندھے فقیر نے ایک خوفناک قہقہہ لگا کر لنگڑے فقیر کو اجنبی زبان میں کچھ کہا ہے۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے اور اس پر کیا بیتی ہے۔

جب راجو کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک لمبے سے برآمدے کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر پڑا ہے اور چراغوں کی روشنی میں بہت سی ڈراؤنی شکلیں اس کے اوپر جھکی ہوئی ہیں اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ درد کی وجہ سے اس کی پنڈلی میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور بری طرح جلن محسوس ہو رہی تھی۔ پیاس بھی لگ رہی تھی مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ کسی سے پانی کے لیے کہے اس نے ٹٹول کر محسوس کیا کہ اس کی پنڈلی پر بہت سی پٹیاں بندھی ہیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ پیاس برابر بڑھتی جا رہی تھی اور حلق بالکل خشک ہو گیا تھا۔ آخر جب بالکل برداشت نہ ہو سکا تو اس نے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا..... "پا.....نی"

تھوڑی دیر بعد کسی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ایک کٹورہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پانی پینے لگا۔ مگر دو ہی گھونٹ پی کر اسے قے آنے لگی۔ یہ کیسا پانی تھا یہ کڑوا کڑوا سا عجیب سے ذائقے کا' پانی ایسا نہیں ہوتا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کٹورا ہٹانا چاہا مگر ایک کڑک دار آواز نے کہا..... نخرے نہ کر گاجر کی اولاد..... پی لے..... یہ دوا ہے۔

آواز اتنی ڈراؤنی تھی کہ اس نے سانس روک کر پھر کٹورے سے منہ لگا دیا اور جلدی سے بچی کھچی دوا پی گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہے اور سارا جسم ہلکا ہو کر اوپر اٹھ رہا ہے۔ درد بھی کم ہو رہا ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔

یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے اور اٹھ کر ناچنے لگے۔

اس نے اٹھنا چاہا مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی مگر چراغوں کی مدھم اور زرد روشنی میں کالی کالی ڈراؤنی شکلوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔

اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

کوئی کہہ رہا تھا..... "بورے شاہ جی..... بھنگ اپنا کام کر رہی ہے"۔

"کیسے نہیں کرے گی"۔ اسی ڈراؤنی آواز نے کہا۔ "بھنگ تو بورے شاہ پر بھی اثر کرتی ہے' یہ تو پھر بچہ ہے گاجر کی اولاد۔

راجو نے ڈراؤنی آواز والے کا چہرہ دیکھنا چاہا۔ مگر اس کی آنکھیں نہیں کھل سکیں۔ البتہ اس نے پہیوں کے زمین پر گھومنے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ ڈراؤنی آواز والے کا قہقہہ سنا جو اس کی آواز سے بھی زیادہ ڈراؤنا تھا.....

(آگے کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے اگلے ماہ ملاحظہ کیجئے' قسط 9)

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2004ء

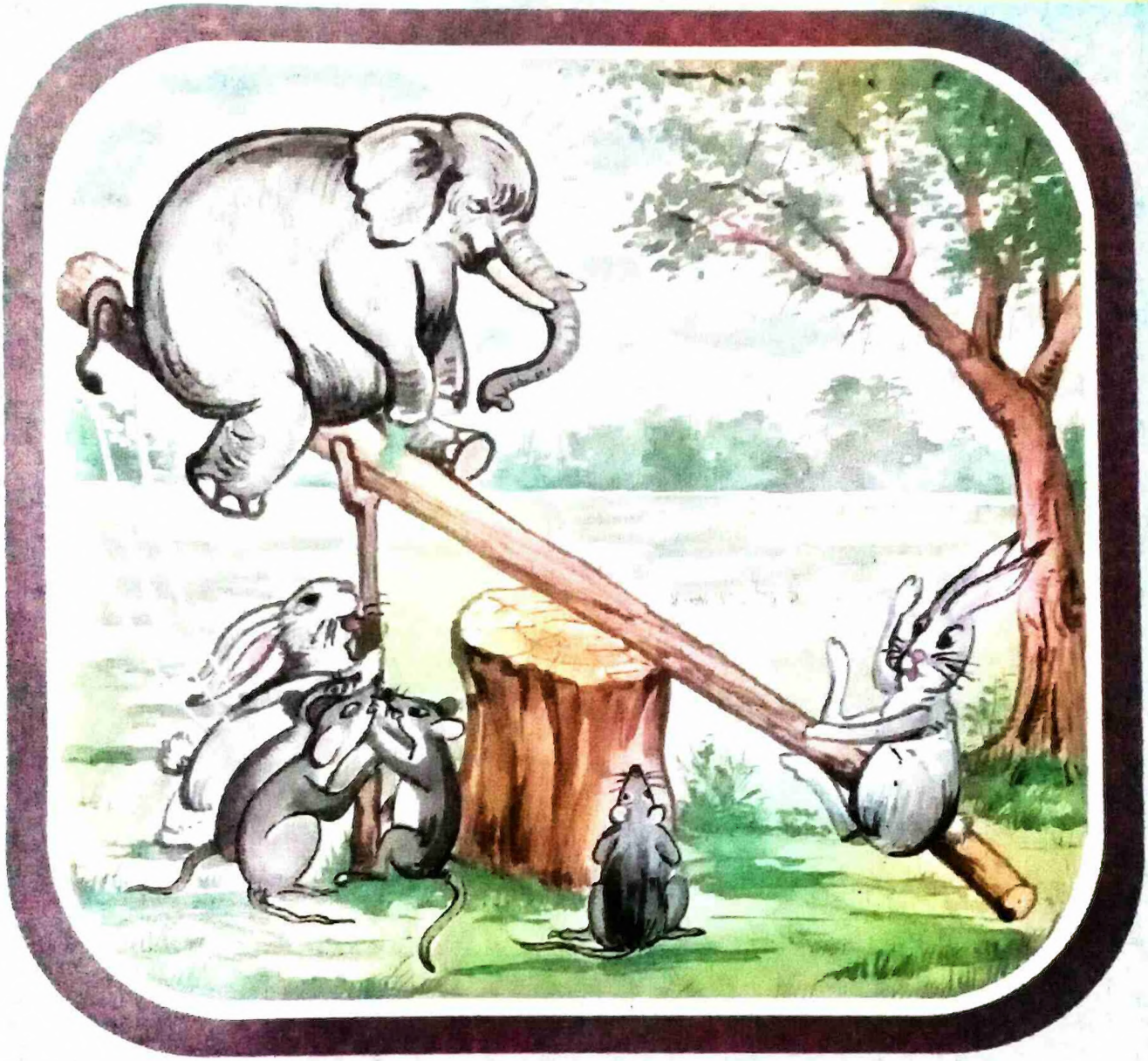

اگست 2004ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے بے شمار عنوان موصول ہوئے جن میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوانات پسند آئے اور ان کے مطابق یہ 6 ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ احمد خالد' ٹوبہ ٹیک سنگھ ("ہماری سواری بڑی نرالی": پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ گیان چند' سانگھڑ (سندھ) ("مہنگا دوستی پیشکش" دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ خدیجہ عمران' راولپنڈی کینٹ ("کم خرچ بالانشین" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ عبیرہ صدیقی' لاہور ("دنیا کا آٹھواں عجوبہ" چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ محمد سرور ظفر' جہلم کینٹ ("ضرورت ایجاد کی ماں ہے" پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ سمیرا انور' خانیوال ("سائیکل یوں بھی چلتی ہے" چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)